تصوّف
اور
نسبتِ صوفیہ
مؤلفہ
حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ
خلیفہ: حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
کتب خانہ مظہری
گلشن اقبال ۲ کراچی

باسمہ تعالیٰ

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

امابعد کتاب تصوف ونسبت صوفیا جو حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ (خلیفۂ حکیم الامت تھانویؒ) کی نہایت عظیم تصنیف ہے احقر نے اس کا مطالعہ کیا ہے یہ کتاب جملہ سالکین اور طالبین کے لئے علمی اور عملی اعتبار سے نہایت اکسیر اور مفید ہے اور اس کا مطالعہ عوام وخواص اور علمائے کرام کے لئے بھی طمانیت قلب اور ترقی روح کا ذریعہ ہے۔

درد دل نے اور سب دردوں کا درماں کر دیا
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا

العارض

حکیم محمد اختر عفی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۷ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

نحمدہ و نصلے علیٰ رسولہ الکریم

مصلح الامت حضرت مولانا دامت برکاتہم کا ایک مضمون بعنوان تصوف اور دوسرا "نسبت صوفیہ" کے نام سے رسالہ معرفت حق میں شائع ہوا جس کو عام طور سے پسند کیا گیا۔ خصوصًا اہل علم حضرات ان دونوں مضامین سے نہایت محظوظ اور لطف اندوز ہوئے اور اس کی نافعیت وافادیت کا اظہار فرمایا اور بعضوں نے تو یہاں تک کہا کہ اس مضمون کو عربی میں شائع ہونا چاہئے تاکہ یہاں کے علاوہ دوسری جگہ کے لوگوں کو بھی نفع پہونچے، اور تصوف و اہل تصوف کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جائیں، بعض مخلص اہل علم نے یہ بھی مشورہ دیا کہ ان دونوں مضامین کو یکجا کتابی شکل میں آجانا چاہئے اس سے زیادہ نفع کی امید ہے۔ اس بناء پر ان دونوں مضامین کو یکجا کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے خدا کرے اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ وباللہ التوفیق۔

قبل ازیں کہ مضامین عالیہ کو ملاحظہ فرمائیں اتنی بات ضرور ذہن میں رکھ لیں کہ حضرت والا دامت برکاتہم اس قسم کے مضامین اکثر وبیشتر بیان فرماتے رہتے ہیں اور مختلف عنوان سے بیان فرماتے ہیں جس کے بعض حصہ کو معرفت حق میں

شائع کیا گیا ہے، وجہ اختصار بیان کی یہ ہے کہ زمانہ انکار و عناد کا ہے بالخصوص
باطنی چیزوں کے تو اکثر اہل ہوا سرے سے قائل ہی نہیں تا بعمل چہ رسد، اور اپنے
اس انکار پر اس امر سے تمسک کرتے ہیں کہ یہ تصوف و طریقت کوئی چیز ہی نہیں
کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ چیزیں نہیں تھیں۔ اس لئے یہ بدعت
و محدث ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یوں پہلے بھی صوفیہ پر انکار کیا گیا ہے مگر چونکہ زمانہ
خیر القرون کے قریب کا تھا اس لئے انکار میں بھی حد سے تجاوز نہ کرتے تھے بلکہ
اکثر تائب ہو کر ان حضرات کے سلسلے میں داخل ہوتے اور اپنی اصلاح کر کے
باطنی دولت حاصل کرتے تھے مگر اب تو عجیب خربط ہے کہ ہر شخص ہی محقق
بنا بیٹھا ہے جس کو ذرا بھی دین و فہم کا حصہ نہیں وہ بھی بڑے سے بڑے شخص پر
انکار کرنے کے لئے تیار ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس انکار کو اپنا
فریضۂ وقت تصور کرتا ہے اس لئے حضرت والا ایسے مضامین کو بڑے ہی شد
و مد سے بیان فرماتے ہیں تا کہ حقیقت کا انکشاف ہو جاوے اور عدم علم کی وجہ
سے جو انکار ہے وہ ختم ہو جائے۔ چنانچہ حضرت والا نے اس مضمون میں
تصوف کی حقیقت اور اس کی غرض و غایت کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے نیز
صوفی کی وجہ تسمیہ اور دیگر ضروری مسائل پر سیر حاصل کلام فرمایا ہے جس کو
دیکھ کر ہر منصف مزاج اور سمجھدار شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ تصوف یا بالعنوان
دیگر طریقت، شریعت اور سنت کے عین مطابق ہے بلکہ شریعت کا مغز اور لُب
ہے۔ اور اس کا مقصود اعلیٰ و مطلوب اسنیٰ ہے، اگر کوئی شخص لفظ تصوف
پر انکار کرے تو کر سکتا ہے اس کو محدث کہے تو کہہ سکتا ہے۔ مگر اس کے مقاصد سے
کون شخص انکار کر سکتا ہے اس لئے کہ تصوف نام ہے تعمیر الظاہر و الباطن کا
یعنی اہل تصوف کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ظاہر کو ان اعمال شرعیہ سے آراستہ

کریں جن کا تعلق ظاہر سے ہے مثلاً نماز، روزہ، وغیرہ ذالک، اور باطن کو ان اعمال سے آراستہ کریں جن کا تعلق باطن سے ہوتا ہے، یعنی عقائد حقہ اور اخلاقِ فاضلہ، مثلاً اخلاص۔ صبر۔ شکر، زہد، تواضع وغیرہ۔

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مشہور رسالہ التکشف میں فرماتے ہیں کہ:۔

"اور کون نہیں جانتا کہ بے شمار آیات اور بے انتہا روایات اعمال باطنی و اخلاق کی اصلاح کی فرضیت پر دال ہیں۔ قرآن و حدیث میں زہد۔ قناعت۔ تواضع۔ اخلاص، صبر و شکر و حب الٰہی و رضا بالقضاء و توکل و تسلیم وغیرہ ذالک کی فضیلت اور ان کی تحصیل کی تاکید اور ان کے اضداد حبِ دنیا، حرص، تکبر و ریاء و شہوت و غضب حسد و نحوہا کی مذمت اور ان پر وعید وارد و مذکور ہے پھر ان کے مامور بہا اور منہی عنہا ہونے میں کیا شبہ رہا اور یہی معنی ہیں اصلاح اعمال باطنی کے، یہی عمل اصلی ہے طریقت میں جس کا فرض ہونا بلا اشتباہ ثابت ہے" انتہیٰ کلامہ

نیز قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رح اپنے رسالہ ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں کہ:۔

"طلب طریقت اور کمالات باطنی حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ۔ اے مسلمانو! ان چیزوں سے جو خدا کو پسند نہیں پورا پورا پرہیز کرو" یعنی کمال تقویٰ کے ساتھ ظاہر و باطن میں کوئی امر عقائد و اخلاق سے خدا تعالیٰ کی مرضی کے

خلاف نہ ہو۔ اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ انتہیٰ کلامہٗ

پس جن چیزوں کی حرمت قرآن وحدیث سے ثابت ہے ان کی اصلاح وازالہ واجب ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ۔ یعنی ظاہری گناہوں کو جن کا تعلق جوارح سے ہے چھوڑو اور باطنی گناہ جو اعمال قلب وصفات نفس سے ہیں ان کو بھی چھوڑ دو۔

نیز فقہ کی مشہور کتاب مقدمہ شامی صفحہ ۳۰ پر ہے کہ :۔

ان علم الاخلاص والعجب والحسد والریاء فرض عین ومثلها غیرها من اٰفات النفوس کالکبر والشح والحقد والغش والغضب والعداوة والبغضاء والطمع والبخل والبطر والخیلاء والخیانة والمداهنة والاستکبار عن الحق والمکر والمخادعة والقسوة وطول الامل ونحوها مما هو بیّن فی ربع المهلکات من الاحیاء قال فیه ولا ینفک عنها بشر فیلزمه ان یتعلم منها ما یریٰ نفسه محتاجًا الیها وازالتها فرض عین

یقیناً اخلاص وعجب، حسد وریاء کا علم فرض عین ہے اسی طرح اس کے علاوہ جو اور آفات نفوس ہیں ان کا علم بھی جیسے کبر، بخل، کینہ، خیانت، غصہ، عداوت بغض، طمع، بخل، بطر، خیلاء، مداہنت استکبار عن الحق، مکر، خداع، قسوت طول امل اور ان کے مثل دوسرے امراض جن کا احیاء العلوم کی ربع مہلکات میں بیان کیا گیا ہے۔

احیاء العلوم میں یہ فرمایا ہے کہ ان امراض سے کوئی بشر خالی نہیں ہے تو لازم ہے کہ ان میں سے جن کا اپنے کو محتاج سمجھے اس کو سیکھے اور اس کا ازالہ فرض عین ہے اور یہ ممکن نہیں ہے جب تک کہ حدود واسباب وعلامات

ولا یمکن الا بمعرفۃ حدودھا	اور اس کے علاج کو نہ جاننے اس
واسبابھا وعلاماتھا وعلاجھا	وجہ سے کہ جس کو شر کی معرفت نہیں
فان من لا یعرف الشر یقع	ہوتی وہ اس میں واقع ہوجاتا ہے ۔
فیہ ۔ مقدمہ شامی صفحہ ۳۱	

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دیکھئے علامہ شامی جو فقہائے متاخرین میں سے ہیں اور انہیں کی کتاب سے عام طور پر فتویٰ دیا جاتا ہے اور ہم سب لوگ اس کو تسلیم کرتے ہیں وہ یہ فرماتے ہیں کہ علم اخلاق کی تحصیل فرض عین ہے اس لئے کہ ہر آدمی (الا ماشاء اللہ) ان مذکورہ امراض میں سے ایک یا اکثر یا کل میں ضرور ہی مبتلا رہتا ہے جن کا ازالہ فرض ہے تو بغیر علم کے ان کی اصلاح و ازالہ کیسے متصور ہوسکتا ہے نیز بہت سے اخلاق ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تحصیل لازم ہے جیسے اخلاص و تواضع وغیرہ تو ان کا حاصل کرنا بھی بغیر علم ممکن نہیں اس لئے اخلاق حمیدہ اور اخلاق سیئہ کا علم ضروری ٹھہرا۔

ان سب کے باوجود آج ابنائے زمانہ جو ادھر نہیں آتے ہیں بلکہ انکار تک کرتے ہیں تو اس کی وجہ حضرت والا دامت برکاتہم یہ بیان فرماتے ہیں کہ چونکہ ظاہر دین کو اختیار کرنا آسان ہے اس لئے اس کو تو اختیار کر لیتے ہیں اور باطنی اعمال اختیار کرنا اور اخلاق کی اصلاح کرنا چونکہ مشکل معلوم ہوتا ہے نفس کو مارنا پڑتا ہے اور اس سے اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں اس لئے باطن میں ہاتھ ہی نہیں لگاتے بلکہ اس کی طرف آتے ہی نہیں۔

نیز یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کام کے لئے آدمی کو عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہونے کی ضرورت ہے ۔ دنیا کو حاصل کر لینا اور صرف ظاہری اعمال کو اختیار کر لینا عالی ہمتی نہیں بلکہ عالی ہمتی یہ ہے کہ تمام تعلقات غیر ضروریہ کو قطع کر کے اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑا جائے اور نسبت مع اللہ حاصل کیجائے مگر ان لوگوں کے لئے تعلقات

کا ترک کرنا موت ہے موت ، اس لئے نہ ان کو ترک کرتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہوتا ہے ، یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے تو صبر کر لیتے ہیں مگر ان علائق سے صبر نہیں - انا للہ وانا الیہ راجعون ، فیا حسرتا داویلتا - اور واقعی یہ ہر کس دنا کس کا کام بھی نہیں - ولقد صدق من قال

ہر حریفے نا سزائے ترک دنیا کے کند　　　　شیر مرد باید و دریا دے مردانۂ

نیز فرمایا کہ علماء پر جیسے یہ فریضہ ہے کہ عقائد و فقہ حاصل کریں اسی طرح ان پر دو فریضے اور بھی عائد ہوتے ہیں - اولاً یہ کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور نسبت حاصل کریں اور ثانیاً یہ کہ رذائل نفس کی اصلاح کریں اور نفس امارہ کو شریعت و سنت کا اتباع کر کے نفس مطمئنہ بنائیں اور یہی تصوف و طریقت کا مقصود ہے اور یہی اس کی غرض و غایت ہے ، مگر اب چونکہ عموماً جو لوگ سلوک میں آتے ہیں اور اپنے کو اہل تصوف کی طرف منسوب کرتے ہیں دیکھا جاتا ہے کہ ان پر کچھ ایسا جمود طاری رہتا ہے اور کچھ ایسے کھوئے گئے ہیں کہ با وجود آمد و شد کے صیحح مقصد کا استحضار نہیں رہتا کہ آخر ہم کو کیا کرنا ہے اور اس آمد و رفت کا مقصد اصلی کیا ہے اس وجہ سے بھی حضرت والا اکثر و بیشتر ایسے مضامین بیان فرماتے ہیں کہ آنے والوں کو بصیرت ہو اور حقیقت امر منکشف ہو کر ان کے لئے لائحہ عمل متعین ہو جائے ، بطالت چھوڑیں اور صدق اختیار کر کے کام پر لگ جاویں تاکہ رسمی آنے جانے والوں کی وجہ سے اصلی تصوف اور اہل تصوف بدنام نہ ہوں ؎

درکسوت خاص آمدہ عامے چند　　　　بدنام کنندۂ نکو نامے چند

کے مصداق نہ بنیں -

جب یہ بات محقق ہو گئی کہ رذائل نفس کا ازالہ اور نسبت مع اللہ کی

تحصیل ضروری ہے تو اب سمجھئے کہ اس کے لئے سب سے آسان صورت یہ ہے کہ اپنے کو کسی کامل مکمل کے سپرد کر دے۔

اس لئے کہ عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ یہ باطنی دولت بغیر خدمت و صحبت اہل اللہ کے حاصل نہیں ہوتی ؎

گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی چو بصاحب دل رسی گوہر شوی

اہلِ کمال کی صحبت کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا بیان حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب اخبار الاخیار کے مقدمہ میں اس طرح فرمایا ہے

امابعد فقیر حقیر اضعف عباد اللہ القوی البادی عبدالحق ابن سیف الدین الترک الدہلوی البخاری معروض می گرداند کہ برارباب الباب و اصحاب البصار کہ زمرۂ اہل خبرت و اعتبار اند محقق و مقرر است کہ مؤثر ترین حالات بلکہ افضل عبادات مصاحبت اہل کمال و مجالست مقربان درگاہ ذوالجلال است۔

زیرا کہ بہ مشاہدۂ استقامت احوال ایشاں سالک را ہمتے دست دہد کہ تحمل اعبائے عبادت و برداشت مشاق ریاضت کہ لازم سلوک ایں طریق است آسان شود۔ بلکہ بمعائنہ

بعد حمد و صلوٰۃ کے فقیر حقیر اللہ قوی و باری کا یہ نحیف ترین بندہ عبدالحق ابن سیف الدین ترک دہلوی بخاری عرض پرداز ہے کہ تمام ان ارباب فہم اور اصحاب بصیرت کے نزدیک جن کا شمار باخبر اور قابل اعتبار ہستیوں میں کیا جاتا ہے یہ امر محقق اور مسلم ہے کہ مؤثر ترین حالت بلکہ افضل ترین عبادت اہل اللہ کی صحبت اور مقربان دربار خداوندی کی ہمنشینی ہے۔

اس لئے کہ ان حضرات کی استقامت (اور ان کے ثبات و استقلال) کو دیکھ کر سالک کے اندر بھی ایک قوت

جمالِ ایشاں نورے در دل افتد کہ ظلمتِ ریب وارتیاب کہ علتِ بُعد وحجاب است زائل گردد۔

(اخبار الاخیار ص۲۶۹)

اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے عبادت کا تعب اور ریاضت کی مشقتوں کا برداشت کرنا جو کہ اس طریق پر چلنے کے لئے لازم ہیں اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ بلکہ ان حضرات کے جمال کے مشاہدہ سے اس کے قلب میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے شکوک وشبہات کی تاریکیاں کہ دراصل وہی بعد اور حجاب ہوتی ہیں اس کے قلب سے زائل ہو جاتی ہیں۔

دیکھئے یہاں حضرت شیخ محدث قدس سرہٗ مصاحبت اہلِ کمال کو افضل عبادات فرمارہے ہیں اور اس کی دلیل یہ بیان فرمارہے ہیں کہ ان حضرات کے ثبات واستقامت کو دیکھ کر سالک کے اندر بھی ایسی قوت وہمت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کی وجہ سے اعمال کی مشقتوں کا تحمل آسان ہو جاتا ہے اور ان کے جمال کے مشاہدہ سے ایسا نور قلب میں آجاتا ہے کہ شک وشبہ کی ظلمت دور ہو جاتی ہے اور حجاب مرتفع ہو جاتا ہے۔

اسی مضمون کی تعبیر بیہقیٔ وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی نور اللہ مرقدہٗ ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"بیشمار لوگوں کی ایک جماعت جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عقل محال سمجھتی ہے اور وہ اس قسم کی جماعت ہے کہ اس کا ہر ایک فرد

بشر تقویٰ اور علم کے باعث ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ
کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے، زبان قلم سے اور قلم زبان سے
(یعنی تحریراً و تقریراً) خبر دیتی ہے کہ ہم کو مشائخ کی صحبت کی وجہ
سے جن کی صحبت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک
پہنچتا ہے، عقائد اور فقہ کے سوا جن سے وہ ان کی صحبت سے
پیشتر بھی بہرہ یاب تھے۔ باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہو گئی
ہے اور اس حاصل شدہ حالت سے ان کے دل میں خدا اور
خدا کے دوستوں سے محبت اور اعمال صالحہ کا شوق اور نیکیوں
کی توفیق اور سچے اعتقادات اور زیادہ راسخ ہو گئے ہیں یہی حالت
ہے جس کو کمال کہنا چاہئے اور یہی حالت بہت سے کمالات کی
موجب ہے" (تحفۃ السالکین ص۴)

قاضی صاحب رح نے مشائخ کی صحبت سے جو فیض و نفع ہوتا ہے
اس پر کتنی عمدہ اور کیسی محکم دلیل بیان فرمائی، کہ بے شمار لوگوں کی ایک جماعت
(متعدد اور مختلف مقامات سے) خبر دیتی ہے کہ ہم کو مشائخ کی صحبت سے عقائد
و فقہ کے سوا باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہو گئی ہے جو پہلے حاصل نہیں تھی۔
پھر اس جماعت کے اوصاف بیان فرماتے کہ اس کا ہر ایک فرد بشر تقویٰ اور
علم کے باعث ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ کی تہمت لگانا جائز نہیں
ہے تو جب کسی جماعت کے ہر ہر فرد کی یہ حالت ہو، پھر ظاہر ہے کہ وہ کس
قدر قابل وثوق اور لائق اعتماد ہوگی۔ اور جب ایسی جماعت حقہ کی لوگ کسی امر
کے متعلق بالاتفاق فیصلہ کریں گے تو یقیناً موجب جزم اور قطع ہوگا۔ گویا قاضی
صاحب یہ فرماتے ہیں کہ تحریراً و تقریراً ہر زمانہ میں اتنے ثقہ لوگ اس امر کے قائل

رہے ہیں کہ حد تواتر کو پہنچ گیا ہے اب اس کے بعد کسی کو مجال انکار نہیں۔ اور باطن میں نئی حالت جو مشائخ کی خدمت سے پیدا ہوتی ہے اس سے مراد احسان ہے جس کا ذکر حدیثِ جبرئیل ان تعبد اللہ کانک تراہ میں آیا ہے
میری سمجھ میں صحبت کی ضرورت و اہمیت پر اس سے زیادہ کلام کی ضرورت نہیں یوں اگر کسی کو تحصیل مطلوب ہو تو حضرت مولانا دامت برکاتہم کا رسالہ فوائد الصحبۃ مطالعہ کر ے، امید ہے کہ اس مختصر کلام سے ضرور کچھ بصیرت ہوگی۔ اور پیش نظر مضمون کے سمجھنے میں اعانت ہوگی۔
اب اخیر میں یہ گذارش ہے کہ جن لوگوں کو بفضلہ تعالیٰ اہل اللہ کی صحبت میسر ہو ان کو چاہئے کہ صدقِ نیت و حسن عقیدت کے ساتھ ان سے تعلق رکھیں اور حاصل شدہ وقت کو غنیمت شمار کر کے ان سے باطنی فیض حاصل کریں ؎

با کریماں کارہا دشوار نیست

اس حقیر کے لئے بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اخلاق کی اصلاح کو آسان فرمائیں اور اپنی محبت و نسبت سے نوازیں آمین۔
اب آپ حضرات کے سامنے حضرت مولانا دامت برکاتہم کے مضامین پیش کئے جا رہے ہیں بغور مطالعہ فرمائیں۔ مَتَّعَنَا اللّٰہُ بِھَا وَاِیَّاکُمْ وَسَائِرَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

یکے از خدام

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

تصوّف

تصوّف کی اصل

حضرت ابو یحییٰ زکریا انصاری شافعی فرماتے ہیں کہ تصوف کی اصل حدیث جبرئیل ہے جس میں آیا ہے کہ ما الاحسان؟ قال ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراك۔ چنانچہ تصوف احسان ہی کا نام ہے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ صوفی، مقرب اور محسن کو کہتے ہیں۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ خود کتاب اللہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امت میں مختلف درجہ کے لوگ ہیں بعض ان میں سے اصحاب یمین ہیں اور بعض کو مقربین کہا جاتا ہے جو شخص اپنے ایمان کو صحیح کرے اور شرعی اوامر و نواہی کے مطابق اپنا عمل رکھے تو یہ وہ لوگ ہیں جو کہ اصحاب الیمین کہلاتے ہیں اور ان امور کے ساتھ ساتھ جس شخص کی غفلات بھی کم ہوں اور نوافل و طاعات کی کثرت ہو اور اس کے قلب پر ذکر اللہ کا استیلاء ہو جائے اور حق تعالیٰ سے مناجات کا تسلسل اور دوام اس کو حاصل ہو گیا ہو ایسے شخص کو مقرب اور محسن کہتے ہیں اور اسی کو صوفی بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت ابو یحییٰ زکریا کا جو قول نقل کیا گیا ہے یہاں ہم اس کو ناظرین کے افادہ کے لئے بعینہ درج کرتے ہیں۔ ہذا النصہٗ۔

وھٰؤلاء الموصوفون بما — اور یہ حضرات جو صفات بالا کے ساتھ

ذکرهم المقربون المتصفون
بالاحسان۔ فی الخبر الصحیح
ما الاحسان؟ قال ان تعبد
الله کانك تراه فان لم تکن تراه
فانه یراك والامة درجاتهم
متفاوتة ینقسمون الی اصحاب
الیمین والی المقربین کما دل
علیه الکتاب العزیز فمن صح
ایمانه وعمل بما امر به شرعًا
فهو من اصحاب الیمین ومن
قلت غفلاته وتوالت منه
نوافله وطاعاته وتوالی
علی قلبه ذکره ودعوته
فهو المقرّب والمحسن ویعبر
عنه بالصوفی الذی صفا
عن الاخلاق المذمومة
وتخلق باخلاق المحمودة
حتی احبه الله تعالی وحفظه
فی جمیع حرکاته وسکناته
کما جاء فی الخبر ما تقرب
المتقربون الی بمثل اداء

متصف ہیں مقربین کہلاتے ہیں اور
یہی وہ لوگ ہیں جو کہ صفت احسان
کے ساتھ متصف ہیں چنانچہ صحیح
حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ احسان
کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی
عبادت اس طرح سے کرو جیسے اس
کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ درجہ نہ حاصل
ہو تو یہ سمجھو یہی کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے
امت کے لوگوں کے درجات مختلف ہیں
بعضے اصحاب یمین کہلاتے ہیں اور بعضوں
کو مقربون کہا جاتا ہے جیسا کہ خود قرآن
حکیم میں آیا ہے لہذا جس کا ایمان درست
ہو گیا اور اس نے مامورات شرعیہ پر
عمل کیا وہ اصحاب یمین کہا جاتا ہے
اور جس کی غفلات کم ہو گئیں اور نوافل
میں دوام اور استمرار اسکو حاصل ہو گیا
اور اس کی طاعات کثیر ہو گئیں اور
ذکر اللہ کا قلب پر استیلاء ہو گیا اور اپنی
تمام حوائج میں حق تعالیٰ کی جانب رجوع
ہونا اور اسی سے دعا کرنا جس کا حال

ما افترضت علیهم ولا یزال
العبد یتقرب الی بالنوافل
حتی احبہ فاذا احببتہ
کنت سمعہ الذی یسمع
بہ وبصرہ الذی یبصر
بہ = الحدیث =

(حاشیہ قشیریہ صہ ۴)

بن گیا وہ مقرب کہلاتا ہے۔ اور اسی شخص
کو محسن کہا جاتا ہے اور اسی کو صوفی
بھی کہتے ہیں جو کہ صفاء سے مشتق ہے
یعنی یہ شخص اخلاق مذمومہ سے پاک و
صاف ہو گیا اور اخلاق محمودہ سے متصف
ہو گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے
محبوب بنالیا اور جملہ حرکات و سکنات
میں اس کے محافظ و نگران ہو گئے۔
جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مجھ سے
تقرب حاصل کرنے والوں میں سے کسی نے
اس جیسا تقرب حاصل نہیں کیا جو کہ
فرائض کی ادائیگی کے ذریعہ حاصل کیا
جاتا ہے (یہ قرب فرائض کہلاتا ہے)
اور بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قرب
حاصل کرتا رہتا ہے (یعنی ادائے فرض
کے بعد کیونکہ اس کے بدون نوافل
سبب قرب تو کیا ہوتے معتبر بھی نہیں)
یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنالیتا
ہوں اور جب وہ مجھے محبوب ہو جاتا ہے
تو پھر میں اس کا کان بنجاتا ہوں جس سے
سنتا ہے اور آنکھ بنجاتا ہوں جس سے

دیکھتا ہے (یہ قرب نوافل کہلاتا ہے)

تصوف نام رکھنے کی وجہ

بعنوانِ دیگر اس کو یوں کہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک کے بعد مسلمانوں میں سے جو لوگ کہ اپنے وقت کے افاضل ہوتے تھے ان کا کوئی خاص نام بجز صحابیؓ رسولؐ کے نہ ہوتا تھا اس لئے کہ صحابیت سے بڑھ کر کوئی فضل و شرف ہی نہ تھا جس کی جانب ان کو منسوب کیا جاتا۔ پھر جب صحابہ کا دور ختم ہوا اور قرن ثانی آیا تو جن حضرات نے صحابہؓ کی صحبت پائی تھی ان کو تابعین کہا جانے لگا اور یہی اس وقت ان کے حق میں سب سے بڑی تعریف سمجھی جاتی تھی پھر ان کے بعد لوگ تبع تابعین کے لقب سے ملقب ہوتے، پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ لوگ مختلف درجات اور متباین مراتب میں تقسیم ہو گئے تو اب اس وقت خواص ناس جن کو امور دین کا شدت سے اہتمام تھا زُہّاد اور عُبّاد کے نام سے پکارے جانے لگے۔ یعنی یوں کہا جاتا تھا کہ "فلاں عابد" "فلاں زاہد" پھر اس کے بعد جب بدعات کا شیوع ہو گیا اور سب فرقوں میں باہم تقابل اور تنافس ہونے لگا یہاں تک کہ ہر فریق دعویٰ کرنے لگا کہ ان کے اندر زہّاد ہیں" یہ دیکھ کر خواص اہل سنت نے جنہوں نے کہ اپنے لئے معیتِ الٰہیہ کو تجویز کیا اور جنہوں نے اسباب غفلت سے اپنے قلوب کی حفاظت کی انہوں نے اپنے مسلک اور طریق خاص کے لئے اسم تصوف تجویز کیا چنانچہ اسی نام سے اس جماعت کے اکابر سن دو سو ہجری سے پہلے پہلے مشہور ہو گئے یہاں ہیں حضرات کو صوفی کہا جاتا تھا۔

(قشیریہ صفحہ ۸)

اور اس میں شک نہیں کہ تصوف کا نام اگرچہ بہت دنوں کے بعد زبانوں پہ آیا تاہم اس کا مصداق اسلام کے قرنِ اول میں بھی موجود تھا جیسا کہ صاحب

ابداع لکھتے ہیں کہ:۔

ظهرت التصوف في القرون الاولىٰ للاسلام فكان له شان عظيم وكان المقصود منه في اول الامر تقويم الاخلاق وتهذيب النفوس وترويضها باعمال الدين وجذبها اليه وجعله وجدانا لها وتعريفها بحكمه و اسراره بالتدريج۔ ص ۳۲۵

فرماتے ہیں کہ تصوف جس وقت اسلام کے قرن اول میں ظاہر ہوا تھا تو اس کے لئے ایک عظیم شان تھی (یعنی وہ ایک عظیم المرتبت چیز تھی) اور ابتداءً اس سے مقصود تقویم اخلاق، تہذیب نفوس اور طبائع کو اعمال کا خوگر بنانا اور ان کو اس کی جانب کھینچ کرلانا اور دین وشریعت کو نفس کی طبیعت اور اس کا وجدان بنانا، نیز دین کے حکم واسرار سے تدریجاً نفس کو واقف کرانا تھا"

اور یہ ظاہر ہے کہ ان مقاصد میں سے ہر ہر مقصد اپنی جگہ پر نہایت ہی صحیح، ضروری اور شریعت کے عین مطابق تھا۔ اس لئے ان سے کسی کو اختلاف یا ان کا انکار نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن علماء ظاہر چونکہ معاملات اور اعمال جوارح ہی سے متعلق احکام کو دین سمجھتے تھے ان حضرات نے اس جماعت پر ان کے اسرار دین کی معرفت وغیرہ کا انکار کیا۔ اور ان کو کج رو اور ملحد کا خطاب دیا۔ ادھر یہ بات بھی ان کے سازگار ہو گئی کہ امرائو سلاطین علماء کے محتاج تھے لہٰذا صوفیاء تنہا پڑ گئے اور بے یار و مددگار ہو کر اور مخالفین کا خوف کر کے اپنے مسلک کو ان سے پوشیدہ رکھنے پر مجبور رہوئے اور اس خیال سے کہ ان کے کلام کو اغیار نہ سمجھیں انہوں نے مخصوص رموز واصطلاحات کو وضع کیا اور اپنے طریق میں داخل

ہونے والوں کے لئے نہایت سختی کے ساتھ پیش آئے، چنانچہ یہ حضرات بڑی شرائط کے ساتھ اور زمانۂ دراز تک آزمائش کر لینے کے بعد تب کسی کو اپنے طریق میں لیتے تھے اور ان کا یہ کہنا تھا کہ جو شخص ہم میں شامل ہونا چاہے اس کو پہلے اپنے طالب ہونے کا ثبوت دینا ہوگا۔ پھر اس کے بعد وہ مرید اور پھر اس کے بعد سالک ہو سکتا ہے، اور پھر سلوک کے بعد دو حال سے خالی نہیں یا تو واصل ہی ہو جائے گا اور یا نہیں تو راجع اور منقطع ہو جائے گا۔

اس تمام تر گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ یہ ان حضرات کی اعلیٰ درجہ کی دیانت تھی اور صدق و اخلاص تھا کہ ایک طویل زمانہ تک طالب کے اخلاق اور اس کے اطوار کو آزماتے تھے تاکہ یہ جان لیں کہ یہ ارادت میں بھی پکا ہے یا نہیں اور اس کی عزیمت صادق ہے یا نہیں یعنی ہمارے طریق میں اس کو خدا کی طلب اور محبت لائی ہے یا محض اس لئے داخل ہو رہا ہے کہ ہمارے یہاں گھس کر ہمارے اسرار سے واقف ہو جائے یعنی ہمارے الفاظ کو صرف چرگنے کے لئے یاد کر لے یا خفیہ بن کر اور ہم میں رہ کر ہماری باتوں کو دوسری جگہ پہنچا دے، بہر حال کامل اطمینان کے بعد کسی کو وہ اپنی جماعت میں لیتے تھے اور پھر آہستہ آہستہ اس پر اعتماد کرتے تھے۔

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی جس کی تعریف علمائے تصوف نے یہ فرمائی ہے کہ:-

ھو علم تعرف بہ احوال تزکیۃ	وہ ایسا علم ہے کہ جس کے ذریعہ نفوس کا تزکیہ
النفوس وتصفیۃ الاخلاق	اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے
وتعمیر الظاھر والباطن	احوال پہچانے جاتے ہیں جس کی غرض
لنیل السعادۃ الابدیۃ	ابدی سعادت کی تحصیل ہے۔

اب آپ خود غور فرمائیے کہ ان میں سے کونسی چیز غلط ہے، نفس کا تزکیہ غلط ہے

یا اخلاق کا تصفیہ بُرا ہے، ظاہر و باطن کی تعمیر لغو ہے، یا سعادت ابدیہ کی تحصیل بے کار ہے، اسی طرح تقویم اخلاق، تہذیب نفس، نیز نفس کو اعمال دین کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنا لینا، ان امور میں سے کونسی شئے مقاصد شرع کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک شئے کتاب و سنت کے عین مطابق ہے اور اللہ و رسول کے منشاء کو پورا کرنے والی ہے۔ اس کے بعد بھی آپ نے یہ دیکھا کہ اس زمانہ میں بھی اور گذشتہ زمانہ میں بھی اس قدر شدومد کے ساتھ اس کی مخالفت کی گئی تو اس کے کچھ اسباب تھے۔

تصوّف کے انکار کی پہلی وجہ

سب سے بڑا سبب تو اس کا یہی ہوا کہ علمائے ظاہر ہی اسرار دین کے مخالف ہو گئے اور چونکہ امراء اور سلاطین پر ان کو تسلط حاصل تھا اس لئے ان کو ان حضرات کے خلاف کر دیا، ظاہر ہے کہ جب علماء اور سلاطین مسلمانوں کے یہ دونوں بڑے طبقے اس جماعت کے مخالف ہو گئے تو لوگوں کو ان کی جانب کیسے توجہ ہو سکتی تھی۔ خاص کر قوم صوفیہ نے جب یہ دیکھا کہ یہ دونوں طبقے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں اور ہماری باتوں کا سننا سنانا اور ان کو رواج دینا تو در کنار، خود ہمارا وجود ہی ان پر شاق ہے تو یہ حضرات گوشہ نشین ہو گئے اور نہایت ہی خاموشی کے ساتھ اندر اندر اپنے کام کو جاری رکھا اور ان حضرات کی مخالفتوں کے باوجود اپنے کام کو چھوڑا نہیں بلکہ طریق کو باقی رکھنے کے لئے اپنے سر اور جان کی بازی لگا دی۔ پکڑے جاتے تھے قید ہوتے تھے بلکہ بعضوں کو تو قتل تک کر دیا گیا لیکن قوم صوفیہ اس خیال کے پیش نظر کہ یہ باطن بھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے دین کا ایک

شعبہ ہے اور اہم شعبہ ہے جس قیمت پر بھی یہ باقی رہ سکے اس کو باقی رکھتا ہے مصائب سہے اور طریق کو باقی رکھا۔ چنانچہ انہیں کے اخلاص کی یہ برکت تھی کہ اس قدر شدید مزاحمت اور موانع کے باوجود بھی طریق زندہ رہا اگرچہ ایک جماعت اس کا انکار بھی کرتی رہی اور اس کے مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی

تصوّف کے انکار کی دوسری وجہ

ایک دوسری وجہ لوگوں کے انکار کی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ طریق چونکہ نہایت ہی اعلیٰ تھا کیونکہ احکام ربوبیت اور آداب عبودیت پر یہ مشتمل تھا اور مخلوق کو خالق سے ملانے کا ذریعہ تھا اس لئے شیطان پر بہت ہی شاق تھا لہٰذا اسے یہ کب گوارا تھا کہ بندے اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق درست کر لیں اس لئے ان کو گمراہ رکھنے کے لئے اس نے ایک طرف تو یہ کیا کہ بہت سے قلوب میں اس کا انکار مزیّن کر دیا اور دوسری جانب یہ کیا کہ بہت سے مدعیانِ طریق بھی ایسے پیدا کر دیئے کہ جو طریق کا زبان سے نام تو لیتے تھے لیکن اصل طریق سے انہیں اصلاً مس نہ تھا۔

بلا شبہ بہت بڑی گمراہی اس طبقہ سے بھی پھیلی۔ یعنی اس نے بزرگوں کے نام پر اپنے ہوئ و نفس کی پیروی کی اور طریق کو بدنام کیا۔ اب اگر منکرین طریق اسی کو اپنے انکار کا منشاء قرار دیں ساد ں نے طریق کے نام پر بہت سے خلاف شرع امور کا ارتکاب کیا تو اس کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے، سالکین کی کوتاہیوں اور بعض اہل طریق کی بے راہ رویوں کو لے کر اصل طریق ہی کا انکار کر دینا نہایت ہی عناد اور بعید از انصاف ہے کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اچھا تصوف کو جانے دیجئے اور اس کی جگہ اسلام کو

لے لیجئے اس کا جو نقشہ آج مسلمانوں کے عمل سے آپ کی نظروں میں کھنچتا ہے کیا وہی حقیقی اسلام ہے؟ اگر نہیں تو کیا ان لوگوں کے غیر اسلامی امور اختیار کر لینے کی وجہ سے اصل اسلام کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر تصوف ہی کا کیوں انکار ہے اور اس میں اور اسلام میں کونسا امر فارق ہے؟

غرض ہم جس تصوف کے اثبات کے قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاح شرع میں احسان کہتے ہیں یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے یا تعمیر الظاہر والباطن کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ ایک با نظم اور با اصول چیز ہے اس میں مریدین کے لئے بھی شرائط ہیں اور شیخ کے لئے بھی اصول و آداب موجود ہیں جن کی رعایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لب کہنا بجا ہے، اور جب ان آداب و شرائط ہی کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ غیر تصوف کو تصوف قرار دیدیا جائے تو پھر تو وہ طریق ہی نہیں جو کہ ہمارا موضوع بحث ہے اس لئے ان کی خرابیوں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح حقیقی تصوف اور اصل طریق کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اب اگر آپ کو تصوف سے محض اس بناء پر چڑ اور انکار ہے کہ اس کا نام محدث ہے تو اس میں ایک تصوف ہی تو متفرد نہیں ہے نہ معلوم کتنی چیزیں اس وقت موجود ہیں اور آپ کا ان سے تعلق بھی ہے جو کہ ابتداء اسلام میں ان ناموں سے معروف نہ تھیں، منصف کے لئے یہ کافی ہے اور دلائل کی بحث از بس طویل ہے۔

اسم تصوف اگر بدعت ہو تو اس کا مسمّٰی بدعت نہیں

میں کہتا ہوں کہ اس کا اسم اگر بدعت ہے تو مسمّٰی تو اس کا بدعت نہیں آپ اس کو احسان سے تعبیر کر لیجئے، علم الاخلاص اس کا نام رکھ لیجئے اور جو شخص کہ اس سے متصف ہو

اس کو محسن، مقرب، متقی اور مخلص کہہ لیجئے اور احسان اور محسن اور متقی اور مخلص کے ذکر سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفہیمات میں فرماتے ہیں کہ:۔

ومعظم مادعت الی اقامتہ الرسول امور ثلثۃ۔ تصحیح العقائد فی المبدأ والمعاد والمجازاۃ وغیرھا وتکفل بھذا الفن اھل الاصول من علماء الامۃ شکراللہ مساعیھم وتصحیح العمل فی الطاعات المقربۃ والارتفاقات الضروریۃ علی وفق السنۃ وتکفل بھذا الفن فقھاء الامۃ فھدی اللہ بھم کثیرین واقام بھم فرقۃ عوجاء

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے احسان کا بیان کیا ہے اور آیات وحدیث سے اس کو مبرہن فرمایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

وتصحیح الاخلاص والاحسان الذین ھما اصل الدین الحنیفی الذی ارتضاہ اللہ لعبادہ قال تبارک وتعالیٰ

۱۔ وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ وذلک دین القیمۃ۔

۲۔ وقال ان المتقین فی جنات وعیون اخذین ما اتٰھم ربھم انھم کانوا قبل ذٰلک محسنین کانوا قلیلا من اللیل مایھجعون وبالاسحار ھم یستغفرون وفی اموالھم حق للسائل والمحروم وفی الارض اٰیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون ○

وقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم انما الاعمال بالنیات وقال فی جواب جبریل الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک ۔

یہاں تک تو مقاصد ثلاثہ کا بیان فرمایا اب آگے ان کے مراتب اور احسان کی ان سب پر ترجیح کا بیان اس عنوان سے فرمارہے ہیں کہ :۔

والذی نفسی بیدہ ھذا الثالث ادق المقاصد الشرعیۃ ماخذاً واعمقھا محتدا بالنسبۃ الی سائر الشرائع وبمنزلۃ الروح من الجسد وبمنزلۃ المعنی من اللفظ وتکفل بھا الصوفیۃ رضوان اللہ علیھم فاھتدوا وھدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادۃ القصوی وحازوا السھم الاعلی ۔ (تفہیمات الٰہیہ ص۱۳ ج ۱)

دیکھئے حضرت شاہ صاحبؒ فرمارہے ہیں کہ اخلاص واحسان ایسی چیز ہے کہ علوم واعمال کی اس کے بغیر کچھ حیثیت ہی نہیں رہ جاتی اور اسی مضمون کو ملا علی قاریؒ نے اپنی کتاب مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں بیان کیا ہے ۔ احسان کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

قیل اراد بہ الاخلاص فانہ شرط فی صحۃ الایمان والاسلام لان من تلفظ بالکلمۃ وجاء بالعمل من غیر نیۃ الاخلاص لم یکن ایمانہ صحیحاً ۔

اس سے معلوم ہوا کہ احسان مرادف ہے اخلاص کے ، بغیر اس کے اسلام اور ایمان دونوں صحیح نہیں ہوتے ، اور عمل کی قبولیت بھی اسی پر منحصر ہے اس کے بغیر علوم اور اعمال کی کچھ حیثیت ہی نہیں رہ جاتی ۔ چنانچہ اعمال کے اعتبار سے تو حضرت شاہ صاحب رح نے یہ فرمایا کہ بدون اخلاص کے وہ جسم بلا روح کے

رہ جاتا ہے، یعنی مردہ اور علوم کے اعتبار سے یوں تشبیہ دی کہ وہ گویا الفاظ بلامعنی رہ جاتے ہیں یعنی بالکل مہمل۔ پس کسی چیز میں اخلاص کے شامل نہ ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ضرر ہوگا کہ وہ بالکل ہی مہمل اور مردہ سمجھی جائے۔

دیکھئے حضرت شاہ صاحب رحؒ نے احسان پر کتنا زوردار کلام فرمایا ہے اور اس کے محصلین کی کتنی مدح فرمائی ہے یعنی اس مقصد کو سب مقاصد سے زیادہ اغمض اور ادق فرمایا ہے اس لئے کہ یہ سب کی روح اور باطن ہے اور جو چیز ایسی ہوتی ہے وہ ادق ہوتی ہی ہے، میرے خیال میں تصوف (یعنی احسان) کی ضرورت پر اس سے بڑھ کر کسی اور عنوان سے کلام نہیں کیا جا سکتا یعنی جس طرح سے فقہ ظاہری کو دیگر علوم وفنون کے مقابلے میں ادق و اعمق و اغمض سمجھا جاتا ہے اسی طرح سے شاہ صاحب فقہ باطن یعنی احسان و اخلاص کو بھی ادق و اغمض فرما رہے ہیں۔

اور سنئیے:۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی کتاب اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں کہ "احسان اشارت باصل تصوف کہ عبارت از صدق توجہ الی اللہ است و جمیع معنی تصوف کہ مشائخ طریقت بآں اشارہ کردہ اند راجع بہ ہمیں معنی اند

نیز حیات شیخ عبدالحق میں ہے کہ ان کے والد ماجد نے ہدایت کی تھی کہ:۔ "ملائے خشک و ناہموار نباشی"، چنانچہ عمر بھر ان کے ایک ہاتھ میں جام شریعت رہا اور دوسرے میں سندان عشق، عشقِ الٰہی کی لگن تو ان کا خاندانی ورثہ تھی شیخ سیف الدین نے ان میں عشق حقیقی کے وہ جذبات پھونک دیئے تھے جو آخر عمر تک ان کے قلب و جگر کو گرماتے رہے۔

(حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص۸۸)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اصلی تصوف کو بہت سراہا ہے اور صوفیہ صافیہ کی عظمت اور جلالتِ شان کو نہایت عمدہ عنوان سے بیان فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

اصل عنوان صوفیہ مرتبۂ عظیم ومقام رفیع ومسلک طریق مستقیم است (حیات شیخ دہلویؒ ص۲۹۵)

حضرات صوفیہ کا اصل عنوان عظیم المرتبۃ اور رفیع المنزلت ہے اور ان حضرات کا مسلک صراط مستقیم ہے۔

صاحب حیات شیخ دہلویؒ تحریر کرتے ہیں کہ :-

"حضرات صوفیہ مقتبسان انوارِ سنت اور مکاشفان سر حقیقت ہیں"

انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قرآن وحدیث کے بعد سب سے زیادہ عزت واحترام کے قابل ہے اس لئے کہ اس کا ایک ایک حرف اس ذہن کی پیداوار ہے جس پر قرآن وحدیث کا رنگ خوب رچ چکا تھا۔ یعنی حضرات صوفیہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ کتاب وسنت کے بعد سب سے زیادہ مستند ہے کیونکہ یہ حضرات مزاج شناس تھے شرع کے، اس لئے کتاب وسنت کے خلاف ہرگز ہرگز لب کشائی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ :-

اگرچہ علم حدیث وتفسیر بالذات برہمہ مقدم است اما درحقیقت تصوف تفسیر کتاب خدا وشرح سنت رسول و مدلول ونتیجہ آنہا است

علم حدیث اور علم تفسیر اگرچہ تمام دیگر علوم پر اپنی ذات کے اعتبار سے مقدم ہے تاہم تصوف بھی کتاب اللہ ہی کی تفسیر اور حدیثِ رسول کی شرح اور اس کا مدلول اور نتیجہ ہی ہے (اس سے الگ اور اس کے مقابل کوئی چیز نہیں ہے)

شریعت اور طریقت میں فرق کرنا گمراہی کی دلیل ہے جو لوگ شریعت پر عامل نہیں وہ صوفیاء کہلانے کے مستحق نہیں۔ انہیں باطنیہ یا حشویہ کہنا چاہیئے
(حیات شیخ ص ۲۹۵)

اور سنئے:۔
اسی مضمون کو علامہ شامیؒ نے بھی بیان فرمایا ہے کہ شریعت، طریقت اور حقیقت میں باہم تلازم ہے چنانچہ مشائخ فرماتے ہیں کہ:۔

الطریقة سلوك طریق الشریعة والشریعة اعمال شرعیة معدودة وهما والحقیقة ثلثة متلازمة لان الطریق الی الله تعالیٰ ظاهر وباطن فظاهرها الطریقة والشریعة وباطنها الحقیقة فبطون الحقیقة فی الشریعة کبطون الزبد فی لبنه لا یظفر بزبد بدون مخضه والمراد من الثلاثة اقامة العبودیة علی الوجه المراد من العبد۔
(شامی صـ۴۲ ج ۱)

حضرت مولانا گنگوہی رح نے بھی اسی مضمون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے مکاتیب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"فی الواقع شریعت فرض اور مقصد اصلی ہے، طریقت بھی شریعت باطنی ہے اور حقیقت و معرفت متمم شریعت ہیں، اتباع شریعت بکمال بدون معرفت نہیں ہو سکتا" (مکاتیب رشیدیہ صـ۲۴)

حضرت گنگوہی رح نے یہ جو فرمایا کہ اتباع شریعت بکمال بدون معرفت کے نہیں ہو سکتا۔ تو اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں وہ یہ کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ:۔ استنزهوا من البول فان عامة عذاب القبر منه

اس میں ترک استنزاہ اور عذاب قبر میں باہم مناسبت ظاہر نہیں ہے یعنی کہ پیشاب سے احتیاط نہ کی جائے تو اس کی وجہ سے عذاب قبر ہوگا۔ اس خاص سزا کو اس جرم کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ تو سنیئے اس کے متعلق حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رح فرماتے ہیں کہ بحر الرائق میں ہے کہ:۔

وجه مناسبة عذاب القبر مع ترك استنزاه البول هو ان القبر اول منازل الآخرة والاستنزاه اول منزل من منازل الطهارة والصلاة اول مايحاسب به المرء يوم القيامة وكانت الطهارة اول مايعذب بتركها فى اول منزل من منازل الآخرة۔

پیشاب وغیرہ سے عدم احتیاط میں اور اس پر عذاب قبر کے ہونے میں مناسبت یہ ہے کہ قبر آخرت کی سب سے پہلی منزل ہے اور تنزہ طہارت کی سب سے پہلی منزل ہے (اور طہارت نماز کا مقدمہ اور اس کی شرط اولین ہے) اور نماز سب سے پہلا وہ عمل ہے جس پر قیامت میں پرسش ہوگی (روز محشر کہ جاں گداز بود۔ اولیں پرسش نماز بود) تو چونکہ طہارت جس کے لئے تنزہ شرط ہے یہ پہلی منزل ہے اس لئے پہلی منزل میں پہلی چیز کے ترک پر عذاب دیا جاتا ہے۔

(بحر الرائق صـ۱۲۰)

سبحان اللہ کیا خوب نکتہ ہے اور کیا اسرار شریعت ہیں، طہارت اور نجاست کا دخل اور اس کا اول منزل ہونا اور اس کا ربط اول منزل آخرت کے ساتھ، یہ ہیں علمائے شریعت اور یہ ہیں اسرار شریعت۔ پس حضرت گنگوہی رحمہ کا یہ ارشاد کہ کامل اتباع شرع بدون معرفت کے نہیں ہو سکتا۔ بجا ارشاد ہے۔

اور شفاء العلیل میں ہے کہ کامل مطلق فی الواقع وہ ہے جو علم ظاہر و باطن دونوں

کا جامع ہو، ورنہ نقصان سے خالی نہیں۔ عالم ظاہر تحصیل نسبت باطن کا محتاج ہے اور باطنی نسبت والا کتاب وسنت کے حاصل کرنے کا حاجتمند ہے تا جامع النورین و مجمع البحرین اور یادگار اولیاء سابقین اور وارث الانبیاء والمرسلین ہو جائے اس کے متعلق حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام مالک رح فرماتے ہیں کہ :۔

من تصوف ولم یتفقہ فقد تزندق و من تفقہ ولم یتصوف فقد تفسق ومن جمع بینہما فقد تحقق

یعنی جو صوفی ہوا اور فقہ نہ حاصل کی پس بلا شبہ زندیق ہوا (یعنی ٹھیٹ کافر) اور جو کوئی فقیہ ہوا اور تصوف نہ حاصل کیا پس بلا شبہ زاہد خشک اور پھیکا سیٹھا کا ملا ہے اور جس نے دونوں کو جمع کیا (یعنی تصوف اور فقہ کو) پس بلا شبہ محقق ہوا۔

دیکھئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح، صاحب مرقات، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح، علامہ شامی رح، حضرت گنگوہی رح غرض سارے ہی محققین ایک ہی بات فرما رہے ہیں۔ یعنی تصوف کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو یہ سبھی حضرات اپنے اپنے وقت میں نہایت شدومد کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں۔ حتیٰ کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں بھی آپ نے اس کا ذکر ملاحظہ فرمایا۔ اور انہیں لفظوں میں (یعنی تصوف کے عنوان سے) ملاحظہ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خیر القرون میں بھی یہ لفظ موجود تھا۔

اور سنئے۔ علامہ شاطبی رح اپنی کتاب الاعتصام میں فرماتے ہیں کہ :۔

الطریق مبنی علی الاخلاص التام بالتوجہ الصادق و تجرید التوحید عن الالتفات الی الاغیار۔

یعنی طریق کی بناء اخلاص تام، توجہ صادق اور التفات الی الاغیار سے توحید

کو مجرد کرنے پر ہے۔ یہ کتاب تحقیق بدعت میں ایک معرکۃ الآراء تصنیف ہے جس میں صوفیائے کرام کے اصل مسلک کو بتایا گیا ہے لہٰذا اس پر کسی کو کلام کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

دیکھئے صوفیائے کرام کا اصل مسلک اخلاص تام، توجہ صادق اور التفات الی الاغیار کے ترک کو فرمایا ہے، غور فرمائیے کہ ان میں سے کونسی چیز قبیح ہے پھر خود ہی اس کا فیصلہ کیجئے کہ جو فن ان پاکیزہ اور شریف امور پر مشتمل ہو اس کی کیونکہ مذمت کی جا سکتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ حضرات تو خود فرماتے ہیں کہ ہمارا طریق ہی توحید کو التفات عن الغیر سے تجرید پر مبنی ہے جیسا کہ حضرت حاجی صاحب رح فرماتے ہیں ؎

آسکے غیر مرے خانۂ دل میں کیسے — کہ خیال رُخ دلدار ہے درباں اپنا

لیکن انہیں کے فن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ التصوف من اقوی الاسباب لوقوع المسلمین فی الجھل بدینھم وبُعدھم عن التوحید الخالص الذی ھو اسّ النجاۃ ومدار صحۃ الاعمال۔

اب جو جماعت یہ کہہ رہی ہو کہ اس کا مقصد ہی توحید خالص ہے اسی کو اس کا مخالف قرار دیا جائے کس قدر عجیب بات ہے اب اس کا منشاء جہل قرار دیا جائے یا کچھ اور۔

بہر حال ؎

وان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ
وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

علماء اور مشائخ کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ طریقت

شریعت کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی روح اور مغز ہے۔
عام طور پر تو یہ مشہور ہے کہ طریق میں رذائل اور ہوائے نفس سے بحث کی جاتی ہے یعنی ایسے طریقے بتائے جاتے ہیں کہ ان کے ذریعہ انسان ہوائے نفس سے چھوٹ جائے اور اس میں اخلاص پیدا ہو جائے لیکن علامہ شاطبیؒ اپنی کتاب الاعتصام میں وضع شریعت کی بھی یہی غرض وغایت فرماتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

الشریعۃ موضوعۃ لاخراج المکلف عن داعیۃ ھواہ حتی یکون عبد اللہ۔

یعنی شریعت کی وضع اس لئے ہوئی ہے کہ مکلف کو اس کی خواہشات نفس کے داعیہ سے نکالا جائے اور صحیح معنوں میں اس کو عبد اللہ (اللہ کا بندہ) بنا دیا جائے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان میں بالعموم داعیہ نفس و ہویٰ موجود ہوتا ہے اور پھر وہ ان کا ازالہ داعیہ شریعت کے ذریعہ کرتا ہے یعنی شریعت کا داعیہ ہویٰ کے داعیہ پر مستولی ہو جاتا ہے اور اس کا بزور و بقہر اخراج کر دیتا ہے جس کی وجہ سے انسان نفس کے داعیہ سے چھوٹ کر نص کے داعیہ پر چلنے لگتا ہے اس لئے عبد اللہ ہو جاتا ہے کیونکہ احکام خداوندی پر چلنے کا داعیہ جس پر غالب ہو وہی عبد اللہ ہے۔

اس موقعہ پر وہ آیت یاد آتی ہے جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کے قاصد کو جب کہ وہ ہدایا لے کر آیا تھا مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

ارجع الیھم فلناتینھم بجنود لا قبل لھم بھا ولنخرجنھم منھا اذلۃ وھم صاغرون۔ یعنی تم ان لوگوں کے پاس لوٹ

جاؤ سو ہم ان پر ایسی فوجیں بھیجتے ہیں کہ ان لوگوں سے اس کا ذرا مقابلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے اور وہ ماتحت ہو جائیں گے یعنی جس طرح ملوک اپنے مخالفین و مقابلین کو بزور شمشیر اور بذریعہ لشکر کثیر دفع کرتے ہیں اور ان کو ان کی سلطنت سے نہایت ہی ذلت اور اہانت کے ساتھ نکال باہر کرتے ہیں، اسی طرح جب حق تعالیٰ کا داعیہ قلب میں پیدا ہو جاتا ہے تو جتنے دوسرے دواعی ہوتے ہیں ان سب پر وہ غالب و مستولی ہو جاتا ہے اور ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ کے داعیہ میں صدہا لشکر اور آہنی شمشیر کی قوت ہوتی ہے اس کے سامنے کوئی داعیہ بھی خواہ نفس و ہویٰ کا ہو یا شیطان کا ٹک نہیں سکتا بلکہ سب کے سب ھباء منثورا ہو جاتے ہیں۔

صحبت کی ضرورت

اب یہ سمجھئے کہ شریعت پر چلنے کے لئے ضرورت تو صرف محرک یعنی صحیح داعیہ پیدا ہونے کی ہے جو کہ کسی کے اندر اگر از خود پیدا ہو جائے تو فبہا مقصود حاصل ہے لیکن عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ جن حضرات پر یہ داعیہ غالب ہو چکا ہوتا ہے اور وہ اپنی ہویٰ کے داعیہ سے خلاصی پا چکے ہوتے ہیں انہیں کی صحبت سے دوسروں میں یہ داعیہ جلد یا بدیر آسانی کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ علماء نے اسی لئے مشائخ کی صحبت کو حصول دین کے حق میں استطاعت میسرہ میں سے شمار کیا ہے۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ القول الجمیل میں فرماتے ہیں کہ:۔

ولیکن لہ وقت یجلس فیہ مع الناس متوجھا الیھم یلقی علیھم السکینۃ فان حجۃ اللہ تعالیٰ لا تتم الا با لاستطاعۃ الممکنۃ ثم الاستطاعۃ المیسرۃ ومن الثانیۃ الصحبۃ

والحث علی الاشغال قولاً و فعلاً و تصرفاً بالقلب واللہ اعلم والیہ الاشارۃ فی قولہ تعالیٰ ویزکیھم ؎

دیکھئے! اس سے معلوم ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے کے لئے قلب میں اتباع شریعت کا داعیہ پیدا کرنا ضروری ہے اور اس میں جو چیز مزاحم ہے یعنی انسان کی ہوئی اور اس کا نفس اس سے خلاصی لازم ہے چونکہ اس کا ذریعہ صحبت ہے اس لئے مقدمۃ الواجب واجبٌ کے قاعدے سے اس کا ضروری ہونا بھی ثابت ہو گیا اور حق تعالیٰ شانہٗ کے ارشاد ویزکیھم سے اس کا اشارہ نکلتا ہے۔

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ جب ترتیب یوں ٹھہری کہ اتباع شریعت فرض اور اس کے لئے داعیہ اتباع لازم اور مشائخ کی صحبت اس کی تحصیل کا آسان ذریعہ۔ تو پھر اب طریق کی نامشروعیت اور اس کا اہمال کہاں سے لازم آیا۔ دینِ کامل کی تحصیل کے لئے مشائخ اہل حق کی صحبت اور ان کی تربیت اور تزکیہ ناگزیر ہے۔ اور یہ مقصد محض مطالعہ کتب سے حاصل نہیں ہو سکتا اگر ایسا ہوتا تو افضل الکتب یعنی کلام اللہ تنہا نازل فرما دیا جاتا نبی یا رسول کی حاجت ہی نہ پڑتی۔ لیکن جب تو کتاب اللہ کے ساتھ رسول کو بھی ... گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ رشد و ہدایت کے باب میں تنہا کتاب کافی نہیں۔ افسوس ہوتا ہے کہ اس راز کو بہت سے انگریزی دانوں نے سمجھا لیکن ہمارے سمجھ میں نہیں آیا۔ اکبر الہ آبادی کہتے ہیں کہ ؎

نہ وعظوں سے نہ کتابوں سے نہ زر سے پیدا   دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

آج کتاب، وعظ، اور زر سبھی کو حصول دین کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور اگر انکار ہے تو بزرگوں کی نظر کا۔ حالانکہ اسی کا نام تزکیہ تھا جس کے متعلق

نص کا اشارہ بیان ہوا۔ اور سنئے :۔

امام ابوالقاسم قشیری اپنی مشہور کتاب رسالہ قشیریہ میں ضرورت شیخ پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :۔

ثم یجب علی المرید ان یتأدب بشیخ فان لم یکن له استاذ لا یفلح ابدًا هذا ابویزید یقول من لم یکن له استاذ فامامه الشیطان وسمعت الاستاذ اباعلی الدقاق یقول الشجرة اذا نبتت بنفسها من غیر غارس فانها تورق لکن لا تثمر کذٰلك المرید اذا لم یکن له استاذ یاخذ منه طریقته نفسًا فنفسًا فهو عابد هواه لا یجد نفاذًا۔ (قشیریہ ص ۱۹۹)

پھر مرید پر واجب ہے کہ کسی شیخ سے ادب (یعنی تعلیم و تربیت) حاصل کرے اگر اس کا کوئی شیخ نہ ہوگا تو وہ کبھی فلاح نہ پائے گا۔ یہ حضرت ابویزید فرماتے ہیں کہ جس کا کوئی شیخ نہیں تو اس کا رہبر شیطان ہے (یعنی اسی کے کہے پر وہ چلے گا) میں نے اپنے استاذ ابوعلی دقاق کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو درخت خودرو ہوتا ہے وہ پتے تو لاتا ہے لیکن پھل نہیں دیتا ہے اسی طرح مرید کا بھی حال ہے یعنی جب اس کے لئے کوئی شیخ نہ ہوگا جس سے کہ وہ طریق شیئًا فشیئًا حاصل کرے تو وہ اپنی خواہش ہی کا بندہ رہیگا اس سے اس کو خلاصی نہیں ہو سکتی۔

اسی کتاب القول الجمیل میں ایک دوسرے مقام پر ضرورت شیخ کے بارے میں شاہ صاحب رحمہ ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔

"والشرط الخامس ان یکون صحب المشایخ وتأدب
بہم دھرًا طویلا واخذ منہم النور الباطن والسکینۃ
وھٰذا لان سنۃ اللہ جرت بان الرجل لا یفلح الا اذا
رای المفلحین کما ان الرجل لا یتعلم الا بصحبۃ العلمآ
وعلیٰ ھٰذا القیاس غیر ذٰلک من الصناعات"

(القول الجمیل ص۲۱)

یعنی پانچویں شرط یہ ہے کہ بیعت لینے والا مرشدین کاملین کی صحبت میں رہا ہو اور ان سے ادب سیکھا ہو زمانۂ دراز تک اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو اور یہ یعنی صحبتِ کاملین اس واسطے مشروط ہوئی کہ عادتِ الٰہی یوں جاری ہوئی ہے کہ مراد نہیں ملتی جب تک کسی مراد پانے والے کو نہ دیکھے جیسے علم انسان کو نہیں حاصل ہوتا مگر علماء کی صحبت سے اسی قیاس پر ہیں اور پیشے جیسے آہنگری، بدون صحبت آہنگر یا نجاری بدون صحبت نجار کے نہیں آتی۔

(فائدہ:۔ مولانا نے ارشاد کیا ہے کہ جریان سنت اللہ کا بھید یہ ہے کہ انسان اس نہج پر مخلوق ہوا ہے کہ یہ اپنے کمالات کو حاصل نہیں کرسکتا بدون اپنے ابنائے جنس کی مشارکت اور معاونت کے بخلاف اور حیوانات کے کہ ان کے کمالات پیدائشی ہیں اور کسبی نہایت کمتر ہیں چنانچہ تیرنا حیوانات میں پیدائشی کمال ہے اور انسان کو بدون سیکھے نہیں آتا)

۔۔۔۔۔۔۔

بیعت کی غرض و غایت اور مشیخیت کے شرائط

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب خلف الرشید حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح کا کلام بھی نقل کردوں جو طریقت کی ضرورت، بیعت کی حقیقت اور شرائط مشیخت وغیرہ پر مشتمل ہے اور اس میں شک نہیں کہ تصوف کا جس قدر صحیح نقشہ حضرت شاہ صاحب رح نے اپنی اس کتاب میں بیان فرمایا ہے کم لوگ اس طرح بیان کرنے پر قادر ہوتے ہیں اپنے اس مختصر سے رسالہ "رسالہ بیعت" میں لکھتے ہیں کہ:

اما بیعت شریعت پس حقیقتش آنکہ مرد عامی کہ عمر را در غفلت و معاصیت گذارندہ ہرگاہ بریں خیال متنبہ می شود و ندامت می کشد و رجوع بر آں تقویٰ و طاعت می خواہد حصول این معنی بدون تحکیم عالم متقی بر ظاہر و باطن خود در عادت منتظم نمی تواند شد چہ دیدن کتابہائے شریعت مانند مراجعت کتب طب است بیمار را بدون حصول ملکۂ طب و معالجہ باین قدر اصلاح مزاج و دفع مرض دشوار است۔

بہرحال بیعت شریعت پس اس کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی عامی شخص جس نے کہ اپنی عمر کو غفلت اور معصیت کے کاموں میں صرف کیا ہو جب اس کو اپنے اس حال پر تنبہ ہو (یعنی اس کے درستگی کا خیال آوے) اور (حالات گذشتہ پر) وہ نادم ہو کر تقویٰ اور طاعت کے کاموں کی جانب رجوع کرنا چاہے تو یہ چیز بدون کسی عالم کے جو ظاہرًا و باطنًا متقی ہو کر اپنے اوپر حاکم بنائے ہوتے یوں ہی بطور خود عادۃً وقوع پذیر نہیں ہوا کرتی کیونکہ شریعت کی

کتابوں کا مطالعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ
کسی طب کی کتاب کی مراجعت کیجائے
(اور یہ سب جانتے ہیں کہ) بیمار کے لئے
بغیر اس کے کہ طب اور معالجہ میں اس کو
ملکہ اور مہارت حاصل ہو محض کتب
بینی کے ذریعہ سے اصلاح کر لینا
اور مرض کا دفع کرنا بہت دشوار ہے

پھر آگے اس کے بعد انتخاب شیخ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

وہمچنیں بقول ہر عالمے عمل کردن موجب
تحیر است کہ ہر یکے صحیح الفکر والحواس نمی
باشد پس بنا براین ضرورت مرشدے
را کہ باوجود علم و تقویٰ دو صفت داشتہ
باشد۔ یکے عدم مساہلت و مداہنت
در مقام امر بالمعروف و نہی عن المنکر
دوم شناختن آنچہ بحال طالب افضل
و اسہل است پس ایں چنیں کس را
اختیار کند و زمام امور خود را بدست او
سپارد و متابعت او بر خود لازم گیرد
تا مراد خود رسد و ثمرہ ایں رسیدن
است بہ نجات کلی در عقبیٰ و دخول او
در جناب العلی و تحصیل رضائے مولی

اور اسی طرح سے ہر عالم کے قول پر عمل
کر لینا تحیر اور تشتت کا سبب ہے۔
کیونکہ ہر عالم بھی تو صحیح الفکر اور صحیح
الحواس نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا اس ضرورت
کے تحت کسی کو اپنا شیخ اور مصلح بنانے
کے لئے ایسے کسی شخص کا انتخاب
کرنا چاہیئے جو کہ علاوہ علم و تقویٰ
کے دو اور اوصاف سے متصف ہو
ایک یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کے باب میں تساہل اور مداہنت کو روا
نہ رکھتا ہو، دوسرے یہ کہ طالب کے
مناسب حال سہل اور افضل جو امور
ہوں ان کی شناخت میں ماہر ہو۔ پس

ایسے شخص کا انتخاب کر کے اپنے تمام امور کی لگام اس کے ہاتھ میں دیدے اور اس کی اتباع کو اپنے اوپر لازم پکڑے تاکہ اپنی مراد کو پہنچے اور اس کا ثمرہ اور نتیجہ آخرت میں نجات کلی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسائی اور مولیٰ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ (رسالہ بیعت ص۲۷)

دیکھئے حضرت شاہ صاحب رح نے یہاں یہ فرمایا کہ بیعت کا حاصل یہ ہے کہ انسان غفلت اور معصیت سے نکل کر تقویٰ اور طاعت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اور اس کے لئے کسی عالم متقی جو کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے باب میں مداہن اور متساہل نہ ہو، نیز طالب کے حال کے لئے جو چیزیں افضل و اسہل ہوں ان سے واقف ہو ایسے شیخ کو اپنے اوپر حاکم بنالے اور باب اصلاح میں اس کی اتباع کو لازم کر لے۔

غور کیجئے کہ ان امور میں سے کونسی چیز محل اشکال ہے۔ ظاہر ہے کہ غفلت کا ترک کرنا ضروری ہے اور معصیت کا بھی اور یہ بھی معلوم ہے کہ خود انسان اس معاملہ میں اپنا علاج کرنے سے قاصر ہے اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی شیخ کامل کو اپنے اوپر اختیار کلی دیدے اور اصلاح نفس کے بارے میں بلا چون وچرا اس کا اتباع کرے اس لئے کہ جس چیز کو خود نہیں سمجھتا اگر دوسر کے سمجھانے میں بھی میم میخ نکالے گا تو پھر اس کی اصلاح ہو چکی۔ آپ خود دیکھئے کہ استاد بچہ سے کہتا ہے کہ کہو الف۔ اب اگر اس نے اتباع کر لی تو اس کے پڑھ لینے کی امید کی جا سکتی ہے اور جو مزاحمت شروع کر دی یعنی یوں کہا کہ کیا

دلیل ہے کہ یہ الف ہے تو اس کے پڑھنے کی کوئی سبیل نہیں یہ جاہل ہی رہ جائے گا۔ یہی مطلب ہے اس کا جو صاحب الابداع نے لکھا ہے کہ :-

ثم انهم جعلوا للشيخ سلطة خاصة على مريديه حتى قالوا يجب ان يكون المريد مع الشيخ كالميت بين يدى الغاسل لان الشيخ يعرف امراضه النفسية وعلاجها فاذا ابيح له مناقشة و مطالبة الدليل تتعسر معالجته او تتعذر فلا بد من التسليم له فى كل شئ من غير منازعة وقالوا ان الوصول الى العرفان المطلق لا يكون الا بهذا -

(الابداع ص ۳۲۵)

پھر اہل طریق نے شیخ کو ایک خاص مرتبہ دیا ہے یعنی مرید پر اس کو تسلط کامل دیا یہاں تک کہ یہ فرمایا ہے کہ مرید کے لئے لازم اور ضروری ہے کہ شیخ کے سامنے اس طرح سے رہے کہ جیسے مردہ بدست زندہ، اور یہ اس لئے کہ شیخ امراض نفسانیہ کا عارف اور اس کے علاج کا ماہر ہوگا۔ لہذا اگر اس سے مناقشہ (یعنی چون وچرا) جائز کر دیا جائے اور یہ کہ مرید اس سے ہر چیز کی دلیل (علت اور لم) پوچھے تو اس کے لئے ایسے شخص کا معالجہ اگر متعذر نہیں تو متعسر ضرور ہو جائے گا (یعنی ناممکن نہیں تو دشوار یقیناً ہو جائے گا) اس لئے ضروری ہوا کہ بدون منازعت اور مناقشت کے ہر امر میں اس کی بات کو تسلیم کرے اور اس کا منقاد رہے چنانچہ ان حضرات نے یہ تک کہہ دیا ہے کہ معرفت تک وصول اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا

(اور یہ صحیح ہے کیونکہ استاذ اگر کسی بچے
سے کہے کہ کہو الف اس پر وہ یہ کہنے لگ
جائے کہ کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے تو
وہ پڑھ چکا۔ تحقیق کا مقام حاصل کرنے
کے لئے اولاً کسی محقق کی تقلید ضروری ہے)

پھر اتخاذ شیخ کے باب میں شاہ صاحب کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کو شیخ بنانے کے لئے اس میں بہت سی شرائط ہیں یعنی ہر شخص کو شیخ نہیں بنایا جا سکتا اس لئے کہ ہر آدمی میں شیخ ہونے کی اہلیت ہوتا تو الگ رہا، ہر شخص صحیح الفکر اور صحیح الحواس بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر انتخاب شیخ میں غور وتامل سے کام نہ لیا اور کسی نااہل کو شیخ بنا لیا گیا مثلاً اس کی فکر اور حواس ہی درست نہ ہوئے تو اس کا بیڑا ہی ہو جائے گا۔ اسی لئے جہاں مشائخ نے ضرورت شیخ پر کلام کیا ہے وہیں اس کی علامات بھی بیان کی ہیں۔ چنانچہ علامہ شاطبی نے الموافقات میں عالم متحقق بالعلم کی تین علامتیں بیان کی ہیں اور یہ اسی لئے تاکہ لوگ علم کو اس کے اہل ہی سے لیں اور نااہل کو مقتدا و پیشوا بنا کر ضیاعِ علم کا سبب نہ بنیں۔

فرماتے ہیں کہ ان تین علامتوں میں سے پہلی علامت یہ ہے

(الاولیٰ) العمل بما علم حتی یکون قولہ مطابقا لفعلہ فان کان مخالفاً لہ فلیس باھل لان یؤخذ عنہ ولا ان	ایک علامت تو یہ ہے کہ اپنے علم پر خود عامل ہو، تاکہ اس کا قول اس کے فعل کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ اگر اس کا فعل قول کے مطابق نہ ہوگا تو یہ شخص اس کا اہل نہیں ہے کہ اس سے علم اخذ کیا

يقتدى به في علم

(الثانية) ان يكون ممن
رباه الشيوخ في ذلك العلم
لاخذه عنهم وملازمته
لهم فهو الجدير بان
يتصف بما اتصفوا به
من ذلك وهكذا كان
شان السلف الصالح
فاول ذلك ملازمة
الصحابة رضي الله تعالى
عنهم لرسول الله صلى الله
تعالى عليه وآله وسلم
واخذهم باقواله و
افعاله واعتمادهم
على ما يرد منه كائنا
ما كان وعلى اى وجه
صدر فهم فهموا مغزى
ما اراد به اولا حتى علموا
وتيقنوا انه الحق الذى
لا يعارض وحكمة الذى

جائے اور نہ اس لائق ہے کہ اسے کسی
علم میں مقتدا بنایا جائے
اور دوسری علامت یہ ہے کہ یہ شخص
ایسا ہو کہ اس علم میں مشایخ نے اس
کی تربیت فرمائی ہو یا یں وجہ کہ اس نے
ان حضرات سے علم حاصل کیا ہو اور
ان کی خدمت میں برابر رہا ہو تو ظاہر
ہے کہ ایسا ہی شخص اس قابل ہوگا کہ
کہ ان صفات کے ساتھ متصف ہو
جن سے اس کے مشایخ متصف
تھے، چنانچہ سلف صالحین کا یہی
طریقہ تھا (یعنی اپنے مشایخ سے اخذ
علم اور ان کی ملازمت کی بناء پر ان
کے اخلاق و صفات سے متصف
ہو گئے تھے) دیکھئے سب سے پہلے حضرات
صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضری کو لازم پکڑا اور آپ کے
اقوال و افعال کو لیا۔ اور جو کچھ آپ
سے صادر ہوا اس پر سبھی نے اعتماد
کیا خواہ وہ جس قسم کی بھی چیز رہی ہو

لا ينكسر قانونها ولا يحرم النقص حول حمى كمالها وانما ذلك بكثرة الملازمة وشدة المثابرة ۔

اور جس نہج پر بھی آپ سے صادر ہوئی ہو اور خواہ ان حضرات نے آپ کے مقصود کو سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو یہاں تک کہ انہوں نے سمجھ لیا اور یقین کر لیا کہ آپ نے جو کچھ کیا یا فرمایا وہ ایسا حق ہے جس کا معارضہ نہیں کیا جا سکتا اور ایسی حکمت ہے کہ جس کا قانون ٹوٹ نہیں سکتا اور جس کے کمال کے گرد نقصان پھٹک نہیں سکتا اور اس میں شک نہیں کہ یہ کیفیت طویل صحبت اور انتہائی صبر و برداشت کے بعد ہی انسان میں پیدا ہو سکتی ہے ۔

(الثالثة) الاقتداء بمن اخذ عنه وتأدب بادبه كما علمت من اقتداء الصحابة بالنبي صلى الله عليه وسلم واقتداء التابعين بالصحابة وهكذا في كل قرن وبهذا الوصف امتاز مالك عن اضرابه اعني بشدة الاتصاف به والا فالجميع ممن يهتدى به في الدين كذلك كانوا

اور تیسری علامت یہ ہے کہ وہ شخص جس سے علوم کو لیتا ہو اس کی اقتداء بھی کرتا ہو اور اس کے آداب سے متودب ہو جیسا کہ تم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی اقتداء کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دیکھا اور ایسے ہی تابعین کے اقتداء کو حضرات صحابہ کے ساتھ و ہمچنیں مسلسل ۔ چنانچہ اس صفت (یعنی اقتداء سلف) کے ساتھ امام مالکؒ اپنے ساتھیوں میں ممتاز ہوئے ہیں یعنی ان کے اندر شدت اہتمام اس کا

ولکن ما لکا اشتھر بالمبالغۃ فی ھذا المعنیٰ فلما ترك ھذا الوصف رفعت البدع رؤسھا لان ترك الاقتداء دلیل علی امر حدث عند التارك اصلہ اتباع الھویٰ۔

(الموافقات ص۹۵ ج ۱)

تھا ورنہ تو دین کے جو لوگ بھی پیشوا ہوئے ہیں سب ہی ایسے ہوتے ہیں۔ اور لیکن امام مالکؒ کی اس باب میں جو شہرت ہوئی تو مبالغہ فی الاہتمام کی وجہ سے لیکن جب یہ طریقہ متروک ہو گیا تو بدعات نے سر اٹھایا اس لئے کہ ترک اقتداء اس امر کی دلیل ہے کہ تارک کے نزدیک کوئی نئی چیز حادث ہو گئی ہے (جب ہی تو اس نے طرز قدیم کو چھوڑا) اور اس کی اصل اور اس کا منشاء اتباع ہوی ہے

دیکھا آپ نے کہ کسی عالم سے علم حاصل کرنے کے لئے علماء نے کتنی شرائط بیان کی ہیں بس یہی شرائط کسی کو شیخ بنانے کی بھی ہیں یعنی اس کے لئے ضروری ہے کہ اوّلاً وہ شریعت پر خود عامل ہو، ثانیاً اس کی تربیت کسی شیخ کامل نے کی ہو جس کے لئے ان کی خدمت میں ایک معتد بہ مدت تک یہ رہا ہو، ثالثاً اپنے مشائخ کی کامل اتباع اور ان کی اقتداء کا کامل داعیہ اس میں موجود ہو۔ اس کے متعلق صاحب موافقات نے فرمایا ہے کہ جب سے یہ وصف (اتباع اسلاف) متروک ہو گیا بدعات نے سر اٹھایا کیونکہ جب مشایخ اور اکابر کی ہی اتباع کو آدمی ضروری نہ جانے گا تو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنے نفس اور شیطان کی اتباع کرے اور اس کا بدعت اور محدث ہونا ظاہر ہے۔

عجیب بات ہے کہ جس علم اور اصول پر چل کر انسان بدعت سے بچ سکتا تھا خود اسی مسلک کو بدعت کہا جانے لگا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فی زمانہ دیکھا

جاتا ہے کہ ایک شخص جاہل اور بدعمل ہے اس کو تو رہبر اور پیشوا بنایا جارہا ہے اور جو شخص کہ ولی کامل ہے اور اس کے سینہ میں اللہ تعالیٰ نے نور کا اور اپنی معرفت کا خزانہ رکھا ہے اسی کے لوگ مخالف ہو جاتے ہیں بلکہ بعض بعض تو اس کو مسلمان تک نہیں سمجھتے۔ فیا للعجب

اللہ تعالیٰ کی محبّت کی فرضیّت

میں یہ کہہ رہا ہوں کہ علم تصوف بدعت نہیں اس لئے کہ اس کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور ہوی کو پہچانے اور اس کو ترک کر کے اللہ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت اپنے قلب میں پیدا کرے کہ اتباع شریعت کے لئے یہی محرک بنتی ہے۔ اور اتباع شرع فرض ہے اس لئے یہ بھی فرض ہے پس جو چیز فرض پر لگا دے وہ مذموم کیسے ہو سکتی ہے۔ اور باقی رہا یہ کہ اللہ و رسول کی محبت کی فرضیت کہاں سے معلوم ہوئی تو اس کے متعلق سنئے :-

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ :-

قل ان کان اٰباۤؤکم وابناۤؤکم	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے
واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم	اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور
واموال ن اقترفتموھا وتجارۃ	تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں
تخشون کسادھا ومسٰکن	اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے
ترضونھا احب الیکم من	کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند
اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ	کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ سے اور
فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہٖ	اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں
واللہ لا یھدی القوم الفسقین	جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو

تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا
حکم بھیجدیں اور اللہ تعالیٰ بے حکمی
کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود
تک نہیں پہنچاتا۔

اس آیت سے نیز یحبہم ویحبونہ سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثبوت ہے اور چونکہ یہ نص قطعی ہے اس لئے یہ محبت فرض ہو گی اور اس کی فرضیت اس لئے ہوئی ہے کہ احکام شرعیہ کا اتباع بدون ان دونوں محبتوں کے نہیں ہو سکتا۔ جس درجہ کی محبت ہو گی اسی درجہ کی اتباع ہو گی یعنی اگر محبت کامل ہو تو اتباع بھی کامل ہو گی۔ اور اگر محبت ناقص ہو گی تو اتباع بھی ناقص ہی رہے گی۔

بہر حال ہر شخص کے لئے اللہ و رسول کی اس قدر محبت فرض ہے جس سے اوامر کا امتثال اور معاصی سے اجتناب کرے۔ چنانچہ فتح الباری شرح بخاری ص۴۶ ج ۱ میں اس حدیث ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما۔ الحدیث کے تحت لکھا ہے کہ

محبۃ اللہ علی قسمین فرض وندب۔ فالفرض المحبۃ التی تبعث علی امتثال اوامرہ والانتھاء عن معاصیہ والرضاء بما یقدرہ فمن وقع فی معصیۃ من فعل محرم او ترک واجب فلتقصیرہ فی محبۃ اللہ حیث قدم ھوی نفسہ ..... والندب ان یواظب علی النوافل ویجتنب الوقوع فی الشبھات والمتصف عموما بذلک نادر قال وکذلک محبۃ الرسول علی قسمین۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فرض، دوسرے مندوب فرض وہ محبت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر کے امتثال اور معاصی سے اجتناب اور مقدر پر راضی رہنے پر ابھارے پس جو شخص کسی معصیت میں (خواہ کسی حرام شے کے ارتکاب کرنے یا کسی واجب کے ترک میں) واقع ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں قصور کی وجہ سے ہے اس لئے کہ اس نے اپنے نفس کی خواہش کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مقدم کیا۔ اور مندوب محبت یہ ہے کہ نوافل پر مواظبت کرے اور شبہات میں واقع ہونے سے اجتناب کرے اور اس محبت سے متصف بالعموم بہت کم لوگ ہیں اسی طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی دو قسم ہے یعنی فرض اور مندوب۔

پس حب اللہ و رسول ؐ کی محبت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے تو اس کی تحصیل بھی شرعاً مطلوب و مامور بہا ہوئی اور ابھی ہم نے بیان کیا ہے کہ تصوف کی یہی غرض ہے لہٰذا اب اس میں کسی کے لئے کیا مجال انکار باقی رہا۔ یہ گفتگو تو ان امور کے متعلق ہے جو طریق میں مقصود کا درجہ رکھتے ہیں باقی اس میں شک نہیں کہ بہت سی چیزیں اشخاص اور ازمنہ کے مناسب بطور وسائل اور ذرائع کے بھی اختیار کی جاتی ہیں چونکہ یہ سب بھی مکملات دین سے ہیں اس لئے ان کو مقصود سمجھنا تو یقیناً غلطی کی بات ہے لیکن اپنی حد پر رکھ کر ان پر عمل کر لینا یہ بدعت مذمومہ نہیں ہے اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ کسی طبیب نے نسخہ میں مثلاً شربت بنفشہ لکھا۔ مریض کو شربت بنفشہ کی ضرورت ہے مگر بازار میں نہیں ملتا اس لئے وہ اس مقصود کی تحصیل کی خاطر کچھ وسائل اختیار کرتا ہے کہ لکڑیاں لاتا ہے آگ جلاتا ہے شکر لاتا ہے دیگچی لاتا ہے، پانی و بنفشہ لاتا ہے اور شکر و بنفشہ وغیرہ کو دیگچی میں ڈالکر

آگ پر پکاتا ہے اور شربت بنفشہ تیار کر کے نسخہ کی تکمیل کرتا ہے تو یہ لکڑیاں لانا، آگ جلانا وغیرہ وغیرہ زیادۃ فی النسخہ نہیں ہے بلکہ لتکمیل النسخہ ہیں اسی طرح صوفیائے کرام نے بھی جو وسائل اذکار و اشغال وغیرہ اختیار فرمائے ہیں یہ سب محبت کی تکمیل اور نسبت احسان کی تحصیل کے لئے ہیں گویا یہ متممات و مکملات دین سے ہیں محبت کی تکمیل و تحصیل کے لئے ان کو اختیار کیا جاتا ہے ؎

از پئے وصلِ نگارے حیلہا انگیختم

ان کو اصل دین اور مقصود کوئی نہیں سمجھتا۔

اقسام نفس

اب یہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے جو چیز مانع و حاجب بنتی ہے وہ انسان کا نفس ہے، علمائے حقیقت نے مختلف تطورات کے اعتبار سے اس کے سات درجے قائم فرمائے ہیں اور ہر درجہ کے لحاظ سے اس کے الگ الگ نام بتلائے ہیں۔ امارہ۔ لوامہ۔ ملہمہ، مطمئنہ، راضیہ مرضیہ، کاملہ، قرآن شریف میں امارہ اور راضیہ، مرضیہ، اور مطمئنہ کا ذکر آیا ہے قال اللہ تعالیٰ۔ وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ وقال تعالیٰ۔ لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ وقال تعالیٰ۔ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔

نفس امّارہ

ہم یہاں پر ان میں سے صرف امارہ، لوامہ اور مطمئنہ کا کچھ بیان کرتے ہیں۔ صاحب ترصیع فرماتے ہیں کہ نفس امارہ کو امارہ اس لئے کہا

جاتا ہے کہ وہ برائیوں کا حکم دیتا ہے اور نفس کی یہ قسم نہایت ہی خبیث ہے ایک معمولی شہوت کے بدلے اپنی آخرت ہی کو بیچ دیتا ہے۔ چنانچہ بخل، حرص، حسد، جہل، کبر، شہوت، غضب، غفلت، شدت طمع، سوئے خلق، بیکار باتوں میں مشغولی، مخلوق کے ساتھ استہزاء، بغض، ہاتھ اور زبان کے ساتھ ایذاء رسانی وغیرہ یہ سب اسی کی صفات ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ نفس اس درجہ میں اپنی طبیعت کے ظلمات میں پڑا رہتا ہے، پس وہ خیر و شر میں تمیز ہی نہیں کرتا بلکہ شیطان کا اس کے اغوا میں وسیلہ اور آلہ کار بنتا ہے۔ چنانچہ تمہارے دو دشمنوں میں سے یہ بڑا دشمن ہے لہٰذا اس سے بہت ہی زیادہ ہوشیار رہو۔

اور پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں کہ اس مقام میں تم پر لازم ہے کہ ابواب شریعت پر وقوف کرو اور ہر آن اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہو اور اس کو موت سے عذاب قبر سے اور قیامت کے ہولناک حالات سے ڈراتے رہو، نیز اپنے لئے ذلت، انکسار، مسکنت، خضوع اور انواع بر اور نوافل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اس کی جانب تضرع اور ابتہال کو لازم کرلو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری طبعی ظلمت سے نکالدے۔ اور یہ ہرگز نہ کرنا کہ گھبرا کر اور ملول ہو کر دعا کرنا چھوڑ دو۔ یا فتح اور کامیابی کو بعید سمجھ کر اس کی جانب سے سست اور تنگ دل ہو جاؤ۔ اس لئے کہ یہ چیزیں تو مرید کے رشتے ہی کو منقطع کر دینے والی ہیں لہٰذا جو چیزیں تبلائی ہیں ان میں تندہی کے ساتھ لگو اور جو امور کہ تم کو تمہارے مولا سے مشغول کر دینے والی ہوں ان سے اعراض کرو، قناعت کو لازم پکڑو اور لذات کو اور بے فائدہ امور میں مشغولی ترک کرو، اپنے رب سے گریہ وزاری کرو اور ہمہ تن اس کی جانب متوجہ ہو جاؤ اس مرتبہ میں یہی سب کام تمہارے کرنے کے ہیں

نفس لوّامہ یہاں تک تو نفس امارہ کا بیان تھا۔ اب نفس لوامہ کے متعلق سنئے۔

نفس لوامہ کو لوامہ اس لئے کہتے ہیں کہ جب اس کا صاحب کسی برائی میں واقع ہوتا ہے تو یہ اس کو ملامت کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی صفات میں سے ملامت ہوئی۔ مکر۔ عجب۔ ریا۔ ظلم۔ غیبت۔ کذب۔ غفلت۔ حب ریاست۔ حب شہوت۔ وغیرہ امور ہیں۔ اور کبھی اس نفس کے ساتھ ساتھ نفس امارہ کی بھی بعض صفات پائی جاتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھتا ہے۔ اور اب بہ نسبت پہلے کے زیادہ سمجھتا ہے اس لئے کہ اس کو ملکوتی مصباح سے جسے اللہ تعالیٰ قلب سالک میں روشن فرماتے ہیں کچھ روشنی مل جاتی ہے۔ ایسی کہ پھر وہی باعث بنتی ہے اس بات پر کہ سالک مجاہدہ کے ذریعہ صفات مذمومہ سے خلاصی پائے اور اخلاق حمیدہ کے ساتھ متصف ہو جائے لیکن ابھی تک وہ خلاصی پائے نہیں ہوتا۔ مگر شریعت کی موافقت کی اس میں ایک رغبت پیدا ہو چکی ہوتی ہے اور اس کے لئے مجاہدہ کا خیال بھی ہو جاتا ہے چنانچہ اس مرتبہ میں اس کے لئے کچھ صالح اعمال بھی ہوتے ہیں، مثلاً قیام، صیام صدقہ وغیرہ۔ لیکن ان میں رذائل کی بھی آمیزش رہتی ہے۔ مثلاً عجب وریا، اور اپنے اعمال صالحہ پر مخلوق کی حمد و ثنا کی خواہش وغیرہ کا ہونا لہٰذا ان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں پر اپنی ان برائیوں کو (مثلاً عجب وریاء) ظاہر کردو، ورنہ یہی سبب انقطاع بن جائے گا۔ پس اس سے خلاصی کے لئے ایک تو مجاہدہ کرنا ہوگا اور دوسرے کثرت ذکر۔ اب اگر اس پر وحدت افعال ظاہر ہو چکا ہے تو پھر اس سے عجب وریاء کا تو خاتمہ ہی ہو جائے گا اس لئے کہ وہ اس وقت کسی عمل کو

اپنا سمجھے گا ہی نہیں تو عجب کس پر کرے گا۔ وہ تو ہمہ وقت اپنے خالق اور مولا کی حمد اور شکر ہی میں لگا رہے گا اور اس بات سے ڈرتا رہے گا کہ اگر شکر میں کوتاہی ہوئی تو یہ دولت ہی سلب ہو جائے گی۔ پس عجب وریاء تو نہ ہو گا البتہ اس مقام میں خواطر، وساوس۔ افکار کی کثرت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ذکر جہر کے ذریعہ انہیں دور کرے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا رہے جن و انس میں سے ہر اس قاطع سے جو اللہ تعالیٰ سے اس کو قطع کر دے۔ یہ بیان نفس لوامہ کا تھا۔ اب نفس مطمئنہ کے بارے میں سنیئے:۔

نفس مطمئنہ

نفس مطمئنہ کی صفات میں سے جود و توکل ہے، عبادت اور تذلل ہے، رضا اور شکر ہے۔ خشیت اور اتباع سنت ہے، اس طور پر کہ امور تکلیفیہ سے ایک بالشت بھی ادھر ادھر نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی صحیح عبودیت اختیار کر کے غیر اللہ سے غنائے تام حاصل کرنا ہے۔ اور سالک کے اس مقام میں داخل ہونے کی علامت یہ ہے کہ تکلیفات شرعیہ میں اس کی کوشش زیادہ ہو جائے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اخلاق کے ساتھ وہ متخلق ہو جائے اس طرح سے کہ آپ کے اقوال صحیحہ کی اتباع کئے بغیر اس کو چین نہ آئے اس لئے کہ یہ مقام تمکین عین الیقین اور ایمان کامل کا مقام ہے اور اس مقام میں ناظرین کی آنکھیں سالک کی زیارت سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور اس کے اقوال کی جانب سامعین کان لگاتے ہیں یہاں تک کہ اگر وہ ساری عمر کلام کرتا رہے تو بھی اس سے ملول نہ ہوا جائے اور یہ اس لئے کہ اس کی زبان اس مقام میں ان حقائق اشیاء اور اسرار شریعت کی ترجمان ہوتی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ اس کے قلب میں ڈالتے ہیں چنانچہ کوئی کلمہ وہ تکلم نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ اللہ و رسول کے

فرمان کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اور اس کا یہ سب بیان کرنا کسی کتاب کے مطالعہ یا کسی سے سننے کا مرہون منت نہیں ہوتا اور اس کے باطن میں حق تعالیٰ کی طرف سے یہ آواز آتی ہے انا سرك ايها الحبيب وانت سري فقر عينا و طب نفسا (یعنی اے حبیب میں تیرا سر ہوں اور تو میرا سر ہے پس اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر اور اپنے نفس کو خوش کر) اس وقت اس سالک کے قلب سے اضطراب دور ہو کر اس کو ایک قسم کا اطمینان نصیب ہو جاتا ہے (چنانچہ اسی جہت سے اس کو مطمئنہ کہا جاتا ہے) اور اب وہ اس وقت حیاء اور ادب کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے خشیت اور ہیبت کو لازم کر لیتا ہے مخلوق کی قبولیت اور ان میں جو عزو وقار اس کو حاصل ہوتا ہے اس کی گدڑی کو اتار پھینکتا ہے اور عالم کون کی حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد کل من علیها فان کی حقیقی تفسیر سمجھ میں آجاتی ہے۔

پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔

کہ جب تم اس مقام میں پہنچو گے تو تمہارا میلان اور ارادہ دواعیہ کی جانب بھی ہوگا۔ اور تمہارے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کچھ اور ہی انداز کی ہو جائے گی جو اس سے پہلے والے مقام کی محبت سے مختلف ہوگی۔ اور یہ یاد رکھو کہ خبردار اس مقام پر پہنچ کر دعویٰ کمال کبھی نہ کرنا یعنی یہ نہ سمجھنا کہ میں ہو گیا ہوں اور نفس سے چھوٹ گیا ہوں کیونکہ اس وقت تو تم نفس کے شر سے مامون ہو جاؤ گے اور اس کے کید سے مطمئن و غافل حالانکہ دشمن سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیئے اگرچہ وہ دوست ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ؎

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت ۔۔۔ دام دان وگرچہ دانہ گویدت۔

اور اس مقام میں کبھی حب ریاست، شہرت اور اپنے آپ کو مشیخت اور

ارشاد کے مقام میں ظاہر کرنے کا داعیہ بھی پیدا ہو جاتا ہے تو ان میں سے کسی چیز کو اپنے نفس کے لئے مت تجویز کر لینا۔ بلکہ اس سے بہت دور رہنا۔ ہاں جب اللہ تعالیٰ ہی تم کو مشیخت کا لباس پہنائیں اور حلیہ قبول سے آراستہ فرمائیں جس میں تمہارا کوئی دخل نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے کام کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اپنے نفس کے لئے نہیں اور جو کچھ کرو اللہ کی مراد سمجھ کر۔ اور اللہ کے اختیار سے کرو نہ کہ اپنی مراد اور اپنا اختیار سمجھتے ہوئے۔

اور علامت اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے مقام ارشاد پر تم کو فائز کر دیا ہے یہ ہے کہ تم اپنے سب بھائیوں کی نظروں میں محبوب ہو جاؤ اور وہ سب کے سب تمہارے امر و نہی کے مطیع ہو جاویں۔ بایں ہمہ تم اپنے لئے ان پر کوئی تمیز اور فوقیت، فخر و سلطنت نہ دیکھنا۔ بلکہ یہی سمجھنا کہ وہی سب لوگ تم سے افضل ہیں۔

پھر آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ جب یہ مقام تم کو حاصل ہو جائے یعنی تم اپنے نفس میں رحمانی طمانیت پانے لگو اور تمہارا قدم کتاب و سنت سے بال برابر بھی نہ پھسلے بلکہ اتباع شریعت تمہارے گوشت پوست میں سرایت کر جائے گویا شریعت ہی تمہاری طبیعت بن جائے تو تم کو الطاف الٰہی کا ہاتھ پورے طور پر جذب کر لے گا (اور یہی یحببکم اللہ ہے) اور یہ جذب اس جذب کے مغائر ہو گا جو اول سلوک میں پیش آیا کرتا ہے (اور وجہ مغائرت یہ ہے کہ یہ جذب اتباع کے بعد ہوا ہے یعنی اس کا سبب اتباع بنتا ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ اور پہلا اتباع سے پہلے کا ہے) اور تمہارے نفس میں سرُّ السّرّ کی لسان سے یہ ندا دی جائے کہ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ اور پھر تم پر ایک خاص قسم کا نسیان

طاری ہو جائے گا جس کی وجہ سے تم دنیا اور آخرت کی کسی چیز کا ادراک ہی نہ کرسکو گے بجز اس کے کہ وہ تمہارے سامنے ہو اور جہاں وہ تم سے غائب ہوئی بس تم بھی اس سے غائب ہو جاؤ گے اور یہ اس لئے کہ تمہارا قلب اس وقت جمال حق کے مشاہدہ میں علی الدوام مشغول ہو جاتے گا۔ نہ اس سے تھکے گا اور نہ اس سے اس کو سیری ہی ہو گی' یہ بیان نفس مطمئنہ سے متعلق تھا جس کو صاحب ترصیع نے بیان کیا ہے۔

میں نے یہاں نفس کا بیان ذرا تفصیل سے اس لئے کیا ہے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس کو مغلوب کرنا کس قدر زبردست مجاہدہ ہے اس کی اہمیت کو حضرات صوفیہ نے سمجھا اور لوگوں کو یہ سمجھا دیا کہ اس کو اگر زیر کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف محبت سے یعنی جب اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہو جائے گی تو نفس ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ علم تصوف میں اصل یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ صحیح نسبت اور حقیقی رابطہ پیدا کیا جائے اسی کی تحصیل کے لئے حضرات صوفیہ نے اپنے ذمہ تین چیزیں لازم کر لی ہیں۔ اخلاء خواطر، معالجہ اخلاق اور نفی غفلت، چنانچہ رسالہ قشیریہ میں ہے کہ:۔

اعمال صوفیہ

لیس للمریدین کثرۃ الاوراد	مریدین کا وظیفہ اوراد ظاہری کی کثرت
بالظاہر فان القوم فی مکابدۃ	نہیں ہے اس لئے کہ قوم کا مجاہدہ تو
اخلاء خواطرھم و معالجۃ	بس تین چیزوں کا ہے۔ اخلاء خواطر
اخلاقھم و نفی الغفلۃ عن	رویہ عن القلب یعنی قلب سے ردی وساوس
قلوبھم لا فی تکثیر اعمال	کا ازالہ، معالجہ اخلاق اور نفی غفلت

البر. الذی لابد لهم منه اقامة الفرائض والسنن الراتبة فاما الزيادات من الصلوٰت النافلة فاستدامة الذكر بالقلب اتم لهم (رسالہ قشیریہ ص۲۰۱)

باقی اور عبادات وغیرہ کی کثرت وغیرہ مطلوب نہیں پس جوان کے لئے ضروری ہے وہ یہ کہ فرائض ادا کریں اور سنن رواتب (مؤکدہ) کا اہتمام کریں اور رہیں دیگر نفلی نمازیں تو قلب کو ذکر کے ساتھ مداوم رکھنا یعنی ذکر قلبی کا اہتمام کرنا ان کے لئے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

اب دیکھئے جن اشیاء کو یہ حضرات قوم کا وظیفہ فرما رہے ہیں ان میں سے کونسی چیز بدعت ہے، خواطر و وساوس کا معاملہ تو معلوم ہی ہے کہ کس قدر اہم ہے بعض مرتبہ ایک معمولی سا وسوسہ منجر الی الکفر ہو جاتا ہے اسی طرح سے اخلاق کی درستگی کا مہتم بالشان ہونا بھی ظاہر ہی ہے۔ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ بدون اصلاح اخلاق کے سالک کے اندر وصول الی اللہ کی استعداد تک نہیں پیدا ہوتی۔ حضرت کا یہ ارشاد حدیث شریف سے مؤید ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ

ان العبد ليبلغ بحسن خلقه عظم درجات الآخرة وشرف المنازل وانه لضعيف العبادة وانه ليبلغ بسوء خلقه اسفل درك جهنم وانه لعابد

بلا شبہ بندہ اپنے حسن خلق کے ذریعہ آخرت کے بڑے درجات اور منازل پالیتا ہے حالانکہ وہ عبادت میں ضعیف ہوتا ہے اسی طرح سے اپنے سوء خلق سے جہنم کے نچلے طبقہ کا مستحق ہو جاتا ہے حالانکہ وہ کثیر العبادت ہوتا ہے۔

اس سے کس قدر اخلاق کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ اس کا درجہ عبادت سے بھی بڑھا ہوا ہے اسی طرح سے نفی غفلت کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہے کہ یہ غفلت ذکر کے منافی ہے اور اسی کی وجہ سے حق تعالیٰ سے نسبت اور تعلق سے محرومی رہتی ہے۔

علاج غفلت

غرض تصوف میں مقصود تو یہی نسبت اور تعلق ہے باقی اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مشائخ نے اپنے اپنے طور پر بعض طریقے تجویز کئے ہیں جو شریعت کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ان کا ماخذ شرع میں موجود ہے، چنانچہ اشغال و مراقبات مثل تصور شیخ وغیرہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں یعنی ذریعہ ہیں مقصود نہیں۔ حضرت مولانا گنگوہی اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:۔

ہر ایک نے اشغال اپنے اپنے طریقہ کے وضع کئے سو یہ سب مقدمات اسی کے ہیں کوئی طریق معین نہیں ہر شخص کا طریق جداگانہ ہے مگر اس زمانہ میں ترک تعلق کو شرط کامل ٹھہرایا ہے ؎

نخست موعظ پیر محصل ایں سخن است — کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید

(مکتوبات رشیدیہ صد۸۱)

اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

تعلق حجاب است و بے حاصلی — چو پیوندہا بگسلی واصلی

ارواح ثلٰثہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کا ملفوظ نقل کیا گیا ہے کہ جس سے اس کی اصل حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ:۔

"آدمی کے لئے سینکڑوں بت ہیں جو اس کو توجہ الی الحق سے مانع ہیں کہیں

اس کا دل مال میں الجھا ہوا ہے کہیں جاہ میں کہیں جورو میں کہیں اولاد میں کہیں معشوق میں الیٰ غیر ذلک، غرضکہ اس کا دل ہزاروں مطلوبات میں مشغول ہے اور یہ مشغولی اس کو توجہ الی الحق سے مانع ہے جب مشائخ نے جو اطباء روحانی ہیں اس مانع کو محسوس کیا تو اس کا علاج تصور شیخ تجویز کیا تاکہ اس کا قلب سب طرف سے ہٹ کر ایک مرکز پر آ ٹھہرے اور اس میں مقصود اصلی کی طرف توجہ کی استعداد پیدا ہو جائے گو یہ تصور خود بھی بت یعنی غیر مقصود تھا مگر بضرورت جمع خاطر اسکو اختیار کیا گیا تھا جب ان کے افکار و خیالات ایک مرکز پر جمع ہو کر اس قابل ہو جاتے تھے کہ وہ مقصود اصلی و حقیقی یعنی حضرت حق کی طرف متوجہ ہو سکیں تو اس بت کو بھی توڑ دیتے تھے اور تصور شیخ کو بیچ سے ہٹا کر اس قلب کو براہ راست حق تعالیٰ سے وابستہ کر دیا جاتا تھا یہ اصلی غرض تھی تصور شیخ کی اور یہ مقصد تھا اس کا (ارواح ثلثہ)

چنانچہ جو حقیقی مشائخ تھے انہوں نے ہر چیز کو اپنی حد پر رکھا اور جو لوگ اس میں مدعی اور دخیل ہو گئے انہوں نے حدود کا لحاظ نہیں کیا بلکہ مقصود کو غیر مقصود غیر مقصود کو مقصود بنا لیا کیونکہ ان کا مطلوب دین تو تھا نہیں اس لئے مشائخ کا بھیس پہن کر اور ان کے الفاظ چرا کر اپنا مطلب حاصل کیا اور اپنے مرتبہ سے بڑھ بڑھ کر دعاوی کئے جس کی وجہ سے پھر وصول ہی سے محروم رہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ ؎

حرف درویشاں بدزد مرد دوں ۔۔۔ تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

اور صاحب رسالہ قشیریہ نے اس کو مریدین کے قلوب کے لئے مضر ترین شئے فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ؎

مرید کے لئے سب سے زیادہ مضر شئے طلب جاہ ہے

ولا شئ اضر لقلوب المریدین من حصول الجاہ قبل خمود لبشریتهم ومن اداب المرید ان لا یسبق علمه فی هذه الطریقة منازلته فانه اذا تعلم سیر هذه الطائفة وتکلف الوقوف علی معرفة مسائلهم واحوالهم قبل تحققه بها بامنازلة والمعاملة بعد وصوله الیٰ هذه المعانی

یعنی بشریت کے مغلوب ہونے سے قبل مریدین کے قلوب میں جاہ پیدا ہوجانے سے زیادہ مضر کوئی چیز نہیں ہے چنانچہ مرید کے آداب میں سے ہے کہ اس طریق میں اس کا علم اس کے مرتبہ سے آگے نہ بڑھنا چاہئیے کیونکہ اگر اس کو صوفیہ کے سیر کا علم ہوگیا اور اس نے ان کے مسائل اور ان کے احوال کی معرفت ان کے ساتھ متصف ہونے اور ان سے سابقہ پڑنے سے پہلے حاصل کر لیا تو پھر تو اس کا وصول ان احوال تک کبھی بھی نہ ہوگا۔

ولهذا قال المشائخ اذا حدث العارف فجهلوه فان الاخبار عن المنازل دون المعارف ومن غلب علمه منازلته فهو صاحب علم لا صاحب سلوک (قشیریه)

اور اسی لئے مشائخ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی عارف معارف کی خبر دے تو اس کو جاہل سمجھو اس لئے کہ خبر منازل (یعنی طے شدہ راہ) کی دی جاتی ہے۔ معارف کی نہیں اور جس شخص کو منازل کا پہلے ہی سے علم ہوگیا ہو وہ علم والا تو کہلائے گا مگر اس کو صاحب سلوک نہیں کہا جائے گا۔

میرا مقصد اصلی تصوف حقیقی صوفیہ کی نصرت ہے نہ غیروں کی

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی صوفی اور ہوتے ہیں اور ڈینگ ہانکنے والے اور۔ چنانچہ میں یہاں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس سے میرا مقصد اصلی اور حقیقی تصوف کو سراہنا اور اسی کی نصرت کرنا ہے تاکہ لوگ اہل طریق سے جو کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول اور محبوب بندے ہیں بدظن اور متنفر نہ ہوں اور ان کی شان میں بدزبانی کا معاملہ روا نہ رکھیں کہ یہ ان کے حق میں سراسر موجب حرمان و خسران ہے باقی جو لوگ کہ صرف مدعیانِ طریق ہیں حقیقی صوفی نہیں ہیں بلکہ صرف صوفیوں کا بھیس بنا کر اصلی تصوف میں تغیر و تبدل کر کے اس کو خلاف شرع بنالیا ہے تو ان متصوفہ کی حمایت مجھے منظور نہیں اور نہ اس تصوف کے ہم مؤید ہیں۔ کیونکہ جس جماعت نے کتاب وسنت کے بتلائے ہوئے راستہ کے خلاف راہ اختیار کر رکھی ہو تو اس پر تو خدا کو اعتراض ہے خدا کے رسول کو اعتراض ہے دین و شریعت کو اعتراض ہے اس لئے مسلمانوں کو بھی اس پر اعتراض ہونا ہی چاہئے اور ایسے لوگوں کو آخرت میں جو سزا ملے گی وہ ملیگی ہی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کے لئے یہ بھی ایک دنیوی عذاب ہے کہ مخلوق خدا کے دل میں ان کی جانب سے نفرت اور ان کے بارے میں زبانوں پہ ملامت جاری ہے۔

حضرت رفاعیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

میرے نزدیک جو صوفی فقیہہ (یعنی عالم) کی حالت پہ انکار کرے (یعنی اس کو بُرا کہے) یقیناً مبتلائے قہر ہے اور جو فقیہہ صوفی کی حالت پر انکار کرے (اسکو بُرا کہے) وہ بھی راندۂ درگاہ ہے۔ ہاں اگر کوئی عالم صرف اپنی زبان سے حکم کرتا ہو۔

شریعت کی ترجمانی نہ کرتا ہو یا صوفی اپنے طور پر راستہ طے کر رہا ہو شریعت کے موافق نہ چلتا ہو تو پھر ایک دوسرے کو برا کہنے میں کسی پر گناہ نہیں ۔

(البنیان المشید ص۱۵۸)

لہٰذا اب ایسے لوگوں کی نصرت جائز ہی کب ہے ؟ اس لئے میری اس گفتگو کا مصداق نہ تو متصوفہ زمانہ ہیں اور نہ رسمی تصوف ہے بلکہ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ اصلی تصوف اور حقیقی صوفیوں کے متعلق کہا ہے جو کہ متمسک بالشریعۃ تھے جن کے بارے میں تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے اپنے نور ایمان سے نہ معلوم کتنے قلوب کو منور کر دیا تھا اور اخلاص ، اخلاق ، اور شفقت علی الخلق کے ذریعہ لوگوں کے قلوب میں گھر کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ حضرات اس حدیث کے پورے پورے مصداق تھے کہ "اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیل سے فرما دیتے ہیں کہ میں اس بندہ سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو پھر اس کے لئے آسمان اور زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے اور وہ سب کو محبوب اور سب کے نزدیک مقبول ہو جاتا ہے"

تصوف کی بدنامی کی ایک خاص وجہ

میرا یہ خیال ہے کہ جن حضرات کو تصوف اور اہل تصوف پر انکار ہے وہ غالباً اسی دوسری ہی قسم پر ہوگا باقی جو حضرات کہ شریعت سے جس قدر قریب ہیں ان پر لوگوں کو اعتراض بھی کم ہوگا۔ تو یہ صحیح ہے کہ شریعت ہی تو اصل ہے چنانچہ ہم بھی جو نصرت صوفیہ کی کر رہے ہیں وہ اسی لئے کہ ہم دیانۃً یہ سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کے قلوب میں شریعت کا پورا پورا احترام ہوتا ہے اور اس اور اس پر یہ حضرات پوری طرح عامل ہوتے ہیں لیکن حقیقی صوفیہ میں بھی ایک طبقہ ایسا ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں تو صادق تھا اور ان کو اللہ تعالیٰ سے صحیح

نسبت اور تعلق بھی حاصل ہوا ہے مگر عملاً کچھ تسامحات بھی ان سے ہو گئی ہیں
تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علم شریعت کا باب نہایت وسیع ہے اس کا احاطہ ہر
ایک کے لئے آسان نہیں۔ اس لئے بظاہر جو کوتاہیاں اس جماعت سے ہوئی
ہیں اس کا سبب ان کی کج خلقی اور اس کا منشاء قلتِ علم تھا۔ چنانچہ انہیں کی
وجہ سے تصوف بدنام ہوا یعنی اس جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن
اخلاق کا مظہر اور نمونہ ہونا چاہئے تھا اس سے اس میں کمی ہوئی اسی لئے اس جماعت
ہی کو لوگوں نے بدخلق مشہور کر دیا اور سبب اس کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے تو ان
کو محبت اور تعلق حاصل ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مخلوق کے حقوق کی
رعایت نہیں کی گئی بلکہ بہت سے لوگوں نے مخلوق سے تعلق کو خالق سے تعلق
کے لئے حاجب اور مانع سمجھا اس لئے انہیں مخلوق سے ملنے ہی میں وحشت اور
ایک قسم کی جھنجھلاہٹ ہوئی یہ لوگ تو اس پر مطمئن تھے کہ مخلوق ہم کو چھوڑ دے تو اچھا
ہی ہے خالق کے ساتھ ہمارا معاملہ یکسو رہیگا لیکن مخلوق نے اسی کو ان کا نقص جانا
اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ اپنے اس اعتراض میں حق بجانب ہیں کیونکہ شریعت
نے جہاں خالق کے حقوق ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے وہیں مخلوق کے حقوق ادا
کرنے کی تاکید کی ہے اللہ و رسول نے اس امر کو پسند نہیں فرمایا ہے کہ انسان
ان کے حقوق اس طرح سے ادا کرے کہ مخلوق کا حق ہی فوت ہو جاتے

چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت
کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبداللہ!
مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تم ہمیشہ تمام دن روزہ رکھتے ہو اور ساری راتیں نماز میں
گذارتے ہو۔ کیا یہ صحیح ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! صحیح ہے
آپ نے فرمایا ایسا مت کرو بلکہ یہ کرو کہ روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، نماز

بھی پڑھو اور سو بھی رہا کرو۔ اس لئے کہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری
آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے اہل خانہ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمان
اور تمہارے پاس آنے جانے والے دوست واحباب کا بھی تم پر حق ہے۔ اس
کی شرح میں صاحب مرقات فرماتے ہیں کہ بدن کا تم پر حق ہے لہذا کھانے پینے اور
سونے اور عبادت کرنے میں اس کی حفاظت رکھو۔ پس تمام ایام روزہ رکھنے
میں اور ہمیشہ ساری رات نماز پڑھنے میں قویٰ کا انحطاط اور بدن کا اختلال ہے
پس افراط و تفریط سے بچو، ایسا نہ ہو کہ تکثیر فی العبادت انقطاع عن العبادت
کا سبب بن جائے، اور یہ جو فرمایا کہ تمہارے مہمانوں کا بھی تم پر حق ہے اس کا
مطلب یہ ہے کہ تم اگر اسی طرح صیام و قیام کرتے رہو گے تو ان کے ساتھ سلوک
اور حسن معاشرت نہ برت سکو گے اور ان کی خاطر و مدارات اور خدمت نہ کر سکو گے
یا تو اس لئے کہ کثرت عبادت سے تمہارا بدن ہی ضعیف ہو جائے گا یا اس لئے کہ
تمہارا سوءِ خلق قوی ہو جائے گا۔

دیکھئے صاحب مرقاۃ نے صوفیوں کا کیسا چور پکڑا۔ سبحان اللہ یہی حضرات
ہیں حقیقی معنی میں محافظِ دین اس جماعت کی دکھتی ہوئی رگ ہی پکڑ لی۔ فرماتے
ہیں کہ تکثیر عبادت سے انسان کا سوئے خلق قوی ہو جاتا ہے وجہ اسکی وہی ہے جو
مذکور ہوئی کہ ان حضرات کو حق تعالیٰ سے ایک ربط خاص اور اس کی عبادت و اطاعت
سے انس پیدا ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کا تعلق اپنے معاملہ میں مخل معلوم ہوتا ہے
اس لئے یہ حضرات مخلوق سے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں اور کبھی ان سے
الجھ جاتے ہیں۔ اب لوگ بجائے اس کے کہ ان کو اس میں معذور سمجھیں یہ خیال
کرنے لگتے ہیں کہ یہ بد خلق ہیں اب واقع میں چاہے ایسا ہو یا نہ ہو۔ بہر حال
اس کا ظاہر تو قابل اعتراض ہے ہی۔ اس لئے کہ اخلاق نبوی کے خلاف ہے

باقی اس کا منشاء ان لوگوں کا تعلیمات شرعیہ سے جہل اور بلاشبہ یہ لوگ ناقص ہیں کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا بھی حق پورا پورا ادا کیا جائے اور مخلوق کے حقوق بھی۔ گویا ایک ہاتھ میں اگر سندانِ عشق ہو تو دوسرے ہاتھ میں شریعت کا جام بھی رکھنا ضروری ہے مگر ان دونوں کے ساتھ کھیلنا ہر ایک کا کام نہیں ہے ؎

بر کفِ جامِ شریعت بر کف سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

غرض اس سے تو انکار نہیں کہ تصوف میں کامل درجہ یہی ہے کہ شریعت کی بھی پوری پوری رعایت کی جائے۔ اب اگر کسی سے اس کے علم کی کمی کی وجہ سے کچھ کوتاہیاں ہوگئی ہیں تو اس کی وجہ سے طریق ہی کی مذمت اور مطلقاً اس کا انکار کرنا تو صحیح نہیں ہے اس لئے کہ یہ شکل تو دوسری جگہ بھی پیش آتی ہے مثلاً دیکھئے اسلام ایک دین ہے اس کے ماننے والے بہت سے لوگ ہیں لیکن کیا سب لوگ برابر کے درجے کے ہیں ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، اگر بہت سے لوگ کامل موجود ہیں تو ایک جماعت ناقص العمل بھی پائی جاتی ہے تو کیا اس کے فسق اور بدعملی کی وجہ سے اسلام پر طعن کیا جاسکتا ہے؟ اس کا سرے سے انکار کر دینا ہی صحیح ہے؟ اسی طرح ایک مدرسہ میں بہت سے طلباء پڑھتے ہیں مدرسین ان کو پڑھاتے ہیں لیکن کیا سب ایک ہی استعداد کے نکلتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بہت سے عالم و فاضل ہوتے ہیں تو بہت سے ناقص الاستعداد اور جاہل رہ جاتے ہیں تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان کے نقص و جہل کی وجہ سے کیا ان اساتذہ کی تعلیم پر اعتراض کیا جاسکتا ہے؟ لہذا جب ایک استاذ کے تمام شاگردوں کا برابر ہونا ضروری نہیں اور کسی شیخ کے تمام مریدین کا یکساں ہونا لازم نہیں اور اس کی وجہ سے ان حضرات کے فضل

وکمال میں کوئی فرق نہیں آتا اسی طرح تصوف کو بھی سمجھ لیجئے کہ ایک طریق و مسلک ہے جس کا مقصود تو شریعت ہی پر عمل کرانا ہے اور ظاہری و باطنی کمال کے ساتھ انسان کو متصف گردانتا ہے لہذا جو طالب صادق مخلص اور موفق من اللہ ہوتا ہے وہ تو صحیح راستہ پکڑ لیتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے اور جو لوگ اس درجہ کے نہیں ہوتے وہ اپنی راہ کچھ کھوٹی ہی کر لیتے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشائخ اپنے کو دھن دیتے ہیں لیکن ان کے پاس آنے جانے والے پورا خلوص نہیں اختیار کرتے تو اس میں مشائخ کا یا تصوف کا کیا قصور ہے۔

طریق صوفیہ و فقہاء کا منتہیٰ ایک ہے حاصل کلام یہ کہ حقیقی تصوف شرع کے مزاحم نہیں ہے جیسا کہ حضرت رفاعیؒ فرماتے ہیں کہ:-

"بزرگو صوفیہ کے طریق کا منتہیٰ وہی ہے جو فقہاء کے طریق کا منتہیٰ ہے اور فقہاء کے طریق کا منتہیٰ وہی ہے جو صوفیہ کے طریق کا منتہا ہے جن گھاٹیوں میں پھنس کر فقہاء مقصود کی طلب سے رہ جاتے ہیں انہیں گھاٹیوں میں صوفیہ بھی اپنے سلوک میں مبتلا ہوتے ہیں دونوں کو مقصود سے روکنے والی ایک ہی چیز ہے یعنی غرض نفسانی اور حب دنیا و حب جاہ اور دونوں کو مقصود تک پہنچانے والی بھی ایک ہی چیز ہے یعنی اخلاص اور ماسوائے حق سے منہ پھیر لینا طریقت عین شریعت ہے اور شریعت عین طریقت ہے دونوں میں صرف لفظی فرق ہے اصل اور مقصود اور نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔" (البنیان المشید ص ۱۵۸)

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام نے ہر زمانہ میں علمائے ربانی کا احترام کیا ہے اور یہ سمجھ کر کہ جس طرح ہماری جماعت کے بہت سے لوگوں سے جو علوم شرعیہ پر حاوی نہیں تھے کچھ لغزشیں ہو گئی ہیں اسی طرح جماعت علماء بھی چونکہ

ہمارے حالات اور مقامات سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکی اس لئے انہوں نے بعض باتوں کو خلاف شرع سمجھتے ہوئے ہماری تکفیر تک کر دی تو ہم بھی ان کو اس میں معذور سمجھتے ہیں اور ان کے لئے ان کے اس فعل پر اجر تام کا حکم لگاتے ہیں۔ چنانچہ امام الصوفیہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی فتوحات میں فرماتے ہیں

وقد وقع لنا التکفیر مع علماء عصرنا و نحن نعذرہم فی ذلک لانہ ما قام عندہم دلیل علی صدق کل واحد من ہذہ الطائفۃ وہم مخاطبون بغلبۃ الظن ومما اعتذروا بہ قولہم لو صدقت القوم فی کل ما یدعونہ لدخل الخلل فی الشریعۃ فلذلک سددنا الباب

ہمارے علماء عصر کے ساتھ واقعہ تکفیر کا پیش آیا (یعنی لوگوں نے ہماری تکفیر کی) اور ہم ان کو اس باب میں معذور قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس جماعت (صوفیہ) میں سے ہر ہر فرد واحد کے صادق ہونے کی کوئی دلیل قائم نہیں ہوتی (تو وہ ہر ایک کو صادق کیسے سمجھ لیں) اور ان کو (شریعت سے) یہی خطاب ہے کہ غلبہ ظن پر عمل کریں (اور ان کو غلبۂ ظن اسی کا ہوا) اور منجملہ ان کے عذروں کے ان کا یہ مقولہ ہے کہ اگر ہم اس جماعت کی تمام دعووں میں تصدیق کرنے لگیں تو شریعت میں خلل واقع ہو جائے اس لئے ہم نے سد باب کر دیا۔

قال الشیخ محی الدین و نعم ما فعلوہ و نحن نسلم لہم

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ کام خوب کیا اور ہم اس کو ان کے لئے مسلم

ذلك ونصوبهم فيه و
نحكم لهم بالاجر التام على
ذلك ولكن اذا لم يقطعوا
بان ذلك الولی مخطئ
فی مخالفتهم فان قطعوا
بخطاه فلا عذر لهم فان
اقل الاحوال ان ينزلوا
الاولياء المذكورين منزلة
اهل الكتاب لا يصدقونهم
ولا يكذبونهم - اه

(التنبيه الطربي ص١٧)

مسلم رکھتے ہیں اور اس میں ان کی
تصویب کرتے ہیں اور اس میں ان
کے لئے اجر کامل کا حکم کرتے ہیں لیکن
اسی وقت تک کہ وہ علماء اس بات کا
قطعی حکم نہ کریں کہ یہ ولی ان کے خلاف
کرنے میں خطاوار ہے (کیونکہ ان کے
خلاف کرنے سے کسی نص قطعی کا خلاف
لازم نہیں آتا جس پر قطعی حکم خطا کا کیا
جاسکے) اور اگر اس کی خطا کا قطعی حکم
کریں تو پھر ان کے پاس (اس کا) کوئی
عذر نہیں (کہ ظن کی مخالفت میں حکم
قطعی کر دیا) کیونکہ ادنیٰ حالت یہ ہے
کہ اولیاء مذکورین کو اہل کتاب ہی کے
درجہ میں رکھیں کہ نہ ان کی تصدیق کریں
نہ تکذیب کریں (جیسا کہ حدیث میں
آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اوپر جو تکفیر
میں معذور قرار دیا ہے اس سے بھی
مراد تکفیر ظنی ہے نہ کہ تکفیر قطعی)

اب دیکھئے کہ اس سے زیادہ شریعت اور اہل شریعت کی کیا عظمت
ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ تو ان کی تکفیر کر رہے ہیں اور یہ حضرات ان کو معذور بلکہ
ماجور قرار دیتے ہیں اور ان کے فتویٰ کو تسلیم اور ان کے فعل کی تصویب فرماتے

ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ منشاء ان کے اس حکم کا شریعت کی حفاظت تھی۔

اتباع شریعت اور اہتمام سنت میں ان حضرات کے واقعات بیشمار ہیں ہم یہاں چند واقعات بیان کرتے ہیں جن سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ شریعت کا اہتمام یہ حضرات کس قدر فرماتے تھے۔

اتباع شریعت کے واقعات

(۱) دلیل العارفین میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے حوالہ سے خواجہ معین الدین چشتی رح کا ملفوظ نقل کیا گیا ہے۔

فرمایا کہ ایک وقت ہم اور خواجہ اجل بیٹھے تھے نماز مغرب کا وقت تھا خواجہ تازہ وضو کرتے تھے کہ انگلیوں میں خلال کرنا ان سے سہوًا فراموش ہوگیا ہاتف غیبی نے آواز دی اور ان کے کان مبارک میں کہا کہ اے اجل ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دوستی کا دعویٰ کرتے ہو اور ان کی امت سے کہلاتے ہو ان کی سنت کو تم نے ترک کیا۔ اس کے بعد خواجہ اجل نے قسم کھائی کہ جس دن سے میں نے نداسنی موت کے وقت تک کوئی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے متروک نہ ہوگی۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک وقت خواجہ اجل کو بے حد متردد دیکھا۔ پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا کہ جس روز سے انگلیوں کا خلال مجھ سے فوت ہوا ہے مجھ کو حیرت ہے کہ کل کے روز قیامت میں یہ منہ خواجۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو کیونکر دکھلاؤنگا

(السنۃ الجلیہ ص۱۱)

ف۔ دیکھئے خلال کے ترک پر اور وہ بھی سہوًا پھر سنت مؤکدہ بھی نہیں صرف مستحب۔ تو کس قدر قلق ہوا ہے۔ کیا یہ حضرات شریعت کے

احکام کے تارک ہو سکتے ہیں؟

حضرت نظام الدین اولیاء راحت القلوب میں حضرت خواجہ بابا
(۲) فرید الدین گنج شکر رح کا ملفوظ نقل کرتے ہیں کہ پھر شیخ الاسلام نے
دعا گو کی طرف منہ کیا اور فرمایا کہ اس راہ میں اصل دل کی حضوری ہے اور دل کی
حضوری اس وقت میسر ہوگی جبکہ حرام لقمہ سے بچیگا اور اہل دنیا کی صحبت سے
پرہیز کریگا (ص ۱۹)

ف :۔ دیکھئے کھانے پینے میں اور صحبت نیک میں بھی پابندی شریعت کی کسقدر
تاکید ہے نیز فرماتے ہیں کہ جو مرید یا شیخ قانون مذہب اہل سنت والجماعت پر
نہ ہوگا اور اس کی کیفیت وحالت وحکایت موافق کتاب اللہ اور سنت
رسول اللہ نہ ہوگی وہ اس معنی میں راہزن ہے۔

ف :۔ کس قدر تصریح کے ساتھ اہل سنت والجماعت کے مذہب
کے اتباع کی تاکید ہے جس سے تمام بدعات کا قلع قمع ہوتا ہے
دیکھئے ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ ان حضرات کو شریعت کا کس قدر
اہتمام تھا۔ ایک واقعہ اور سنئے۔

ایک بزرگ کتا پالے ہوئے تھے کوئی عالم صاحب ان کے یہاں تشریف
(۳) لے گئے انہوں نے کہا کہ حضرت حدیث شریف میں کتا پالنے کی
ممانعت آئی ہے یہ آتا ہے کہ جس گھر میں کتا ہوتا ہے اس میں رحمت کے
فرشتے نہیں داخل ہوتے۔ حالانکہ حدیث شریف میں استثناء بھی آیا ہے
یعنی حراست کے لئے یا شکار وغیرہ کے لئے کتا پالنا جائز ہے۔ بہرحال ان
عالم کی زبانی ان بزرگ نے جونہی یہ سنا۔ کتے کو مخاطب کر کے کہا کہ بھیا
تم یہاں سے چلے جاؤ، مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ نبی صاحب نے کتا

پالنے کو منع فرمایا ہے یہ سننا تھا کہ کتا اٹھا اور ایک طرف کو چل دیا پھر اس کے بعد کسی نے ان بزرگ کے یہاں اس کو نہیں دیکھا معلوم نہیں کہ کہیں جاکر مر گیا یا کسی دوسرے شہر ہی چلا گیا۔ بہر حال ان بزرگ کا یہ عمل اور ان کی صحبت اور محبت کی وجہ سے کتے پر یہ اثر قابل عبرت ہے۔

(۴) اسی طرح سے انوار العارفین میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات میں ہے کہ حضرت خواجہ کا حال کبھی جمال کا ہوتا تھا اور کبھی جلال کا چنانچہ جب جمال کا غلبہ ہوتا تو اس میں اس قدر مستغرق ہو جاتے کہ اس دنیا و مافیہا سے بالکل ہی بے خبر ہو جاتے۔ پس جب نماز کا وقت ہوتا تو حضرت خواجہ قطبؒ اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ حضرت اقدسؒ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر بآواز بلند الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہتے حضرت کو کچھ خبر نہ ہوتی دوبارہ حضرت خواجہؒ کے کان میں الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہتے اس پر بھی ہوش نہ آتا پھر یہ دونوں خدام حضرتؒ کا کاندھا مبارک ہلاتے تب آنکھ کھولتے اور فرماتے۔ سبحان اللہ شریعت محمدی سے چارہ نہیں ہے۔ اللہ اللہ کہاں سے کہاں لے آئے یہ فرما کر وضو کرتے اور نماز ادا کرتے۔

ف۔ دیکھئے ایسی مغلوبیت کی حالت میں بھی احکام شرعیہ میں کوتاہی نہیں کی! سبحان اللہ!

(۵) اسی طرح سے حضرت شیخ جلال الدین پانی پتیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک بار سکر کے عالم میں ان کی زبان سے بعض الفاظ شطحیات کے نکلے جب صحو کے عالم میں آئے تو خادموں نے عرض کیا کہ زبان مبارک سے شریعت کے خلاف ایسی ایسی باتیں نکلی ہیں فرمایا کہ خدا

کی پناہ میں تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو گیا۔ اس کا کفارہ دینا چاہئے چنانچہ جاڑوں کی ٹھنڈی ہوا تھی آدھی رات کے وقت دریائے سندھ کے کنارہ پر تشریف لے جاتے تھے اور برف کو توڑ کر جو پانی پر جما ہوتا تھا گلے تک پانی کے اندر ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر دوسرے کو ران پر رکھ کر یہ ذکر کرتے تھے کہ "دینِ محمدؐ قائم دائم۔ دینِ محمد قائم دائم۔ جاڑے کی شدت سے تمام بدن پھٹ کر خون بہتا تھا مگر صبح کے وقت پھر غسل کر کے فجر کی نماز ادا کرتے تھے۔ چھ ماہ تک اس مجاہدہ میں رہے حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے تسکین بخشی (یہ ان بزرگ کا غلبہ حال ہے جو قابل اتباع نہیں ہے) تاشر
سبحان اللہ! کس قدر شریعت کا پاسِ ادب تھا۔ عظمت شرع کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سے حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (۶) کے مکتوبات میں ہے کہ شیخ الاسلام شیخ فتح اودھی تین روز متواتر سماع میں مشغول رہے اور پانچوں وقت نمازیں ادا کرتے رہے تین دن کے بعد جب سکون ہوا تو احباب نے عرض کیا کہ تین دن گذرے ہیں۔ دریافت فرمایا کہ نماز ادا ہوئی۔ عرض کیا ادا ہوئی اس کے بعد شیخ محمد عیسیٰ جو حضرت کے خلیفہ تھے ان کے پاس یہ مسئلہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ یہ نماز صحیح ہوئی یا نہیں؟ شیخ محمد عیسیٰ نے جواب میں لکھا کہ حقیقت میں نماز تو وہی ہوئی جو حضرت مخدوم نے (اس حالت میں) ادا کی لیکن شریعت کی رعایت کی وجہ سے دوبارہ پڑھ لیں۔

دیکھا آپ نے ان حضرات کو شریعت کا کس قدر لحاظ تھا۔ حضرت شیخ کا یہ حال اور ان عالم کا یہ فتویٰ عدیم المثال ہے۔

(۷) اسی طرح سیرت الاقطاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شیخ شرف الدین پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے لب کے بال بہت بڑھ گئے تھے مگر کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ ان کو کاٹ دے۔ قاضی ضیاء الدین سنامی قدس سرہٗ چونکہ شریعت کا جوش دل میں رکھتے تھے ایک ہاتھ میں قینچی لی اور دوسرے ہاتھ سے ان کی ریش مبارک پکڑ کر ان کے لب کے بال کاٹ دیئے۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد سے حضرت شیخ ہمیشہ اپنی داڑھی کو بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ ایک بار شریعت محمدی کی راہ میں پکڑی گئی ہے (اس لئے قابل قدر ہو گئی ہے)

سبحان اللہ! ان حضرات کو شریعت محمدی کے ساتھ کس درجہ شغف و تعلق تھا کہ جو چیز ان کی جانب منسوب ہو جاتی اس کا بھی یہ حضرات اس درجہ احترام فرماتے چنانچہ ان کا حال ہی یہ تھا کہ ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است — افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را — کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اس نوع کے صدہا واقعات ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے قلوب میں شریعت کی عظمت علماء ظاہر سے کسی طرح کم نہ تھی اور یہ لوگ عمل بالشرع میں ان سے بھی بڑھے ہوئے ثابت ہوئے اس لئے کہ صاحب دل ہوتے تھے اور ان کے قلوب اخلاص سے معمور ہوتے تھے۔ اس جگہ ہم بس انھیں چند واقعات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

آخر میں ایک ضروری بات اور بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ اوپر جو مشایخ کے واقعات اتباع سنت کے سلسلے میں بیان کئے گئے ہیں تو مشایخ محققین میں سے زیادہ تر تعداد ایسے ہی لوگوں کی رہی ہے باقی کوئی کوئی

بزرگ ایسے بھی ہوئے ہیں کہ جو اپنے عام احوال میں تو صادق ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان سے کوئی ایسا قول یا فعل بھی صادر ہو گیا ہے جس کو شریعت پر مطابق کرنا مشکل ہوا ہے بلکہ بعض تو نصوص شرعیہ کے صریح مزاحم معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً دہلی کے کسی بزرگ کا واقعہ ہے کہ رمضان شریف کا مہینہ تھا روزے سے تھے۔ کسی بڑھیا نے شربت کا پیالہ پیش کیا لے کر پی گئے اور یہ فرمایا کہ اس کی وجہ سے ساٹھ روزے کفارے کے رکھنے مجھے آسان معلوم ہوتے لیکن اس کی دل شکنی گوارہ نہیں ہوئی۔ یہاں بھی اشکال ہوتا ہے کہ مخلوق کی دل شکنی کا تو خیال آیا لیکن حق تعالیٰ کی حکم شکنی کی شناعت نظروں سے اوجھل رہی یہ کب جائز تھا۔

غرض اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں جن سے عدم احترام شرع معلوم ہوتا ہے تو اس کے متعلق کلی جواب یہ عرض کرتا ہوں کہ مسلمان اس کا مکلف ہے کہ اپنے اقوال و افعال و احوال میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدا کرے اور ان سب کو شریعت پر پیش کر کے ان کو شریعت کے مطابق کرے۔ شریعت کی نص خواہ اللہ تعالیٰ کی ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب پر مقدم ہے۔ حضرات مجتہدین فرماتے ہیں کہ اتر کوا قولی بخبر الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مقابلے میں میرے قول کو چھوڑ دو

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کلام العشاق یطوی ولا یروی یعنی اہل محبت اور مغلوب الحال بزرگوں کی باتیں انہیں کے لئے تہہ کر کے رکھ دی جائیں گی ان کی روایت اور

اشاعت نہیں کی جائے گی۔

پس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ عشاق کے حال کو ان کے لئے مسلم رکھا جائے گا اور معذور قرار دیا جائے گا۔ بشرطیکہ دلیل سے ان کا صدق معلوم ہو۔ ایسے حضرات کا اتباع نہ کیا جائے گا۔ اتباع نصوص ہی کا کیا جائے گا۔ ورنہ دین میں بڑا رخنہ پیدا ہو جائے گا۔ بلکہ اسی اصول کے پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے ایک بڑا رخنہ پیدا ہو گیا ہے (نعوذ باللہ منہ) اور اس میں شک نہیں کہ جامع شریعت و طریقت ہوتا ہے مشکل کام اور ایک اعلیٰ اور رفیع مقام ہے جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

بر کفِ جام شریعت بر کفِ سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

نسبتِ صوفیہ

فرمایا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحؒ نے اپنی کتاب "القول الجمیل" میں لکھا ہے کہ:۔

ثم لصاحب المداومة علی السکینة احوال رفیعة تنوبه مرة و مرة فلیغتنمها السالك ولیعلم انها علامات قبول الطاعات وتاثیرها فی صمیم النفس وسویداء القلب۔

(شفاء العلیل ص۹۵)

جاننا چاہیئے کہ سکینہ پر مداومت کرنے والے کے حالات رفیعہ ہوتے ہیں جو نوبت بہ نوبت اس کو ملتے ہیں لہذا سالک کو چاہیئے کہ اپنے ان حالات رفیعہ کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ حالات اس کی طاعات کے عند اللہ مقبول ہونے اور ان کے باطن نفس میں اثر کرنے کی علامات ہیں۔

اب آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ جانتے ہیں کہ سکینہ کسے کہتے ہیں؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نہ سکینہ کو جانتے ہیں اور نہ صاحب سکینہ کو پہچانتے ہیں اور نہ احوالِ رفیعہ ہی سے واقف ہیں اور یہ اس لئے کہ آج اس طریق کو لوگوں نے بدنی سمجھ رکھا ہے یعنی یہ

سمجھتے ہیں کہ کسی کو پا جاؤ تو بس اس کے بدن پر گرو اسی سے کامیاب ہو جاؤ گے باقی اس میں کسی چیز کے جاننے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے میں اس بات کو اکثر کہا کرتا ہوں اس لئے کہ دیکھ رہا ہوں کہ لوگوں نے طریق کے علم و عمل کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور لطف یہ ہے کہ پیری و مریدی باقی ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کیونکہ مرید تو اسے کہتے ہیں جو اپنی رائے اور ارادہ کو فناء کر کے کسی کامل و مکمل شیخ سے اس لئے تعلق قائم کرے کہ وہ اس کو اس کی رعونت نفس (انانیت) سے نکال کر اللہ تعالیٰ کا عارف بنا دے اور شیخ کے متعلق ابن عربی اپنے زمانہ کا حال لکھتے ہیں کہ :-

ان الزمان مشحون	زمانہ لمبے چوڑے جھوٹے دعووں سے
بالدعاوی الکاذبة العریضة	بھرا ہوا ہے نہ کوئی مرید ہی صادق
فلا مرید صادق ثابت	اور سلوک میں ثابت قدم نظر آتا ہے
القدم فی سلوکه ولا	اور نہ کوئی شیخ ہی محقق نظر پڑتا
شیخ محقق ینصحه	ہے جو کہ مرید کی خیر خواہی کرے اور
فیخرج من رعونة نفسه	اس کو نفس کی رعونت اور خود رائی
واعجابه برأیه ویعرب له	سے نکالے اور طریق حق اس کے
عن طریق الحق فالمرید	سامنے ظاہر کرے (چنانچہ جب کوئی
یدعی الشیخوخة والرياسة	شیخ کامل نہیں رہ جاتا تو پھر) مرید
وهذا کله تخبیط و	ہی شیخوخت اور بڑائی کا مدعی ہو جاتا
تلبیس ؛	ہے اور یہ سب خبط و تلبیس ہے

(آداب الشیخ والمرید ص ۲)

لہذا شیخ محقق جب اس زمانہ میں نایاب تھا تو اب ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں جو کہ پہلے زمانہ سے یقیناً اچھا نہیں ہے شیخ کامل کے وجود کا کیا حال ہوگا پھر جب شیخ کا وجود ہی نہیں ہوگا تو مرید کہاں سے آجائیں گے۔ اسی کو کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں پیر بہت ہیں اور مرید کا پتہ نہیں یا یوں کہہ دیجئے کہ مرید تو بہت ہیں اور پیر کا پتہ نہیں۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے۔

اصل یہ ہے کہ طریق سے جہالت اور دین سے عدم مناسبت (بے مناسبتی) کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس کی بھی خبر نہیں کہ طریق میں مقصود کیا ہے اور کون کون سی چیزیں غیر مقصود ہیں۔ اس نہ جاننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مقصود کو تو چھوڑ ہی دیا اور غیر مقصود کو مقصود بنا لیا۔ اسی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شیخ اور پیر جو کہ وسیلہ اور ذریعہ تھا اس کو مقصود سمجھ لیا گیا اور اس کے بدنی قرب کو کافی سمجھا گیا اور اللہ تعالیٰ سے صحیح نسبت اور شیخ جس نور اور دولت کا حامل ہوتا ہے اس کی جانب اصلاً توجہ نہیں رہی۔

طریق کا مقصد اور اس کا منتہا کیا ہے۔ نیز یہ کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے اس کے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی کتاب میں نہایت عمدہ کلام فرمایا ہے اسی سے آپ کو سکینت کی تعریف بھی معلوم ہو جائے گی جس کا ذکر میں نے ابتداء میں کیا ہے اس لئے پہلے حضرت شاہ صاحب رحؒ کی عبارت نقل کرتا ہوں اس کے بعد اس کی مزید توضیح کروں گا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

مرجع الطرق کلھا الی تحصیل ھیئاۃ نفسانیۃ تسمّٰی عندھم

تمام مشائخوں کے طُرُق کا مرجع یعنی مقصد منتہیٰ اور حاصل ایک ہیئت نفسانی کی تحصیل ہے جس کو صوفیہ

بالنسبة لانها انتساب و ارتباط بالله عزّ وجلّ و بالسکینة و بالنور و حقیقتها کیفیة حالة فی نفس الناطقة من باب التشبیه بالملٰئکة او التطلع الی الجبروت ۔ (القول الجمیل)

نسبت کہتے ہیں (یہاں نفسانی سے مراد شہوانی نہیں ہے جو کہ روحانی کے مقابلہ میں ہوتا ہے بلکہ نفس سے مراد یہاں نفس ناطقہ انسانی ہے پس ہیئتِ نفسانی کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے نفس میں حاصل شدہ ایک کیفیت اور حالت) اس لئے کہ اس کے ذریعہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت اور ارتباط حاصل ہوتا ہے اسی نسبت کا ایک نام سکینہ ہے اور اسی کو نور بھی کہا جاتا ہے اور نسبت کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک کیفیت کا نام ہے جو نفس ناطقہ میں حلول کرجاتی ہے جس کے سبب سے نفس کے اندر ایک ملکی شان پیدا ہوجاتی ہے اور عالم بالا سے باتیں اخذ کرنے کا ایک ملکہ پیدا ہوجاتا ہے ۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات ۔ طہارت اوراذکار وغیرہ پر مداومت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے اس کو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنے کا ایک ملکہ راسخہ پیدا ہوجاتا ہے ۔ اسی ملکہ کا نام نسبت، سکینہ اور نور ہے اور حصول

نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو ادھر توجہ تام ہو گئی اور اس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہو گیا ورنہ تو حق تعالیٰ کو تو بندہ سے نسبت ہوتی ہی ہے جیسا کہ مولانا روم رح فرماتے ہیں ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب النّاس را با جانِ ناس

یعنی حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ ایک ایسا اتصال (یعنی نسبت) حاصل ہے جس کی نہ تو کیفیت کا بیان ہو سکتا ہے اور نہ کسی چیز پر اس کو قیاس کیا جا سکتا ہے لیکن اس نسبت کے حصول کے طریقے الگ الگ ہیں اور نسبت بطور قدر مشترک کے سبھی طرق میں پائی جاتی ہے اور وہ ایک ہی ہے جیسا کہ شفاء العلیل میں ہے کہ :-

"حضور مع اللہ رنگ برنگ ہے جس کسی کو جس قدر تعلق اور محبت اور کسر نفس کی توفیق ہوگی اسی قدر اس میں ملکہ قویہ حاصل ہوگا اور نسبتیں بےشمار ہیں چنانچہ اشغالِ قادریہ، چشتیہ، اور نقشبندیہ وغیرہ سے غرض اسی نسبت کی تحصیل ہے اور اس پر دوام و مواظبت اور اس کے اندر استغراق ہے تاکہ نفس میں اس مواظبت اور توجہ دائمی سے ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتے" (تاکہ اس کے بعد پھر غفلت اور ذہول کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور ملکہ کی وجہ سے احکام شرعیہ پر چلنا آسان ہو جاتا ہے اور ملکات سیئہ کا اثر نہیں ہونے پاتا۔)

آگے حضرت شاہ صاحب رح بطور دفع دخل کے یہ فرماتے ہیں کہ سلاسل اربعہ میں اشغالِ صوفیہ سے مقصود نسبت کی تحصیل ضرور ہے

لیکن حصول نسبت ان میں منحصر نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:-

ولا تظنن ان النسبة لا
تحصل الا بهذه الاشغال
بل هذه طريق لتحصيلها
من غير حصر فيها وغالب
الرأى عندى ان الصحابة
والتابعين كانوا يحصلون
السكينة بطرق اخرىٰ
فمنها المواظبة على
الصلوات والتسبيحات
فى الخلوة مع المحافظة
على شريطة الخشوع
والحضور ومنها المواظبة
على الطهارة وذكر هاذم
اللذات وما اعده الله
للمطيعين له من الثواب
وللعاصين له من العذاب
فيحصل الفكاك عن
اللذات الحسية والقلع
عنها ومنها المواظبة
على تلاوة الكتاب

اور یہ گمان نہ کرنا کہ نسبتِ مذکورہ
کی تحصیل کا ذریعہ محض یہی اشغال
صوفیہ ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اشغال
بھی تحصیل نسبت کا ایک طریقہ ہی ہے
جس طرح سے اس کے اور بھی طریقے
ہیں۔ چنانچہ ظن غالب میں فقیر کا یہی ہے
کہ صحابہ اور تابعین اس نسبت اور
سکینہ کو دوسرے طریقہ سے حاصل
کیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک طریق اس
کا یہ تھا کہ پابندی کے ساتھ نماز
پڑھتے تھے اور خلوت میں تسبیحات
کا التزام اور اہتمام فرماتے تھے اور
ان تمام امور میں خشوع اور خضوع
اور حضور قلب کا خاص خیال رکھتے تھے
نیز ایک طریقہ تحصیل نسبت کا یہ بھی
تھا کہ (ظاہری و باطنی) طہارت پر
مداومت رکھتے تھے۔ اسی طرح سے
لذتوں کو توڑ دینے والی چیز یعنی موت
کا ہمیشہ استحضار رکھتے تھے، نیز اللہ
تعالیٰ نے مطیعین کے لئے جو اجر و ثواب

والتدبر فیہ واستماع کلام المواعظ وما فی الحدیث من الرقاق (القول الجمیل)

اور انعام واکرام تیار کر رکھا ہے اور نافرمانوں کے لئے جو عذاب وشدائد مہیا کر رکھے ہیں ان سب کو برابر پیش نظر رکھتے تھے جس کی وجہ سے لذات حسیہ سے وہ بالکلیہ چھوٹ جاتے تھے اور ان سب چیزوں نے ان کے قلب سے عیش دنیا کا قلع قمع کر دیا تھا۔ اسی طرح سے ایک طریقہ حصول نسبت کا پابندی کے ساتھ کتاب اللہ کی تلاوت اور اس کے معنی میں غور کرنا اور واعظ وناصح کی بات پر کان دھرنا اور صمیم قلب سے اس کا سننا تھا اسی طرح سے حدیث شریف کے وہ مضامین جن سے قلوب میں نرمی پیدا ہو ان کا سننا بھی تھا

دیکھئے شاہ صاحب نے طرق تحصیل نسبت کی یہاں کیسی وضاحت فرمادی یعنی یہ کہ حضرات صحابہ کرام نسبت کی تحصیل ان ہی تمام چیزوں سے فرماتے تھے ورنہ عام طور پر یہ غلط فہمی ہو رہی تھی کہ حصول نسبت کا ذریعہ صرف مشایخ کے اذکار ومراقبات ہی ہیں حالانکہ وہ بھی ایک طریق ہے اس میں انحصار نہیں ہے۔

اس سے قبل حضرت شاہ صاحب نے فرمایا تھا کہ:۔

والغرض من الاشغال اشغال صوفیہ سے غرض اسی نسبت کی

تحصيل نسبة والمواظبة	تحصیل اور اس پر دوام اور مواظبت
عليها والاستغراق فيها	اور اس میں مستغرق رہنا ہے تاآنکہ
حتى تكتسب النفس منها	نفس اس مواظبت اور مداومت سے
ملكة راسخة	ملکہ راسخہ کسب کر لے۔

اور اس کے بعد آگے چل کر فرماتے ہیں (جہاں ان امور کا ذکر کیا ہے جن کے ذریعہ حضرات صحابہ و تابعین تحصیل نسبت فرماتے تھے) کہ :۔

فبالجملة فكانوا	حاصل کلام یہ کہ حضرات صحابہ و
يواظبون على هذه	تابعین اشیاء مذکورہ (یعنی اعمال
الاشياء مدة كثيرة	شرعیہ پر) ایک کثیر مدت تک مواظبت
فتحصل ملكة راسخة	و دوام فرماتے تھے جس کی وجہ سے
وهيئة نفسانية	ان کے اندر تقرب الی اللہ کا ایک
فيحافظون عليها	ملکہ راسخہ اور ہیئت نفسانیہ حاصل
بقية العمر وهذا	ہو جاتی تھی اسی پر یہ حضرات بقیہ عمر
المعنى هو المتوارث	محافظت فرماتے تھے جس کا اثر یہ ہوتا
عن رسول الله صلى	تھا کہ کیفاً وہ نسبت اور بڑھتی جاتی
الله عليه وسلم	تھی یہی وہ نسبت ہے جو رسول اللہ
من طريق مشائخنا	صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے مشائخ
لا شك في ذلك و	کے واسطہ سے متوارث چلی آرہی ہے
ان اختلف الالوان	جس میں ذرا بھی شک نہیں۔ اگرچہ
واختلفت طرق تحصيلها	الوان اس کے مختلف و تحصیل کے
(القول الجميل)	طریقے رنگ برنگ ہیں۔

اس میں تصریح ہے کہ سلف ملکۂ راسخہ حاصل کرتے تھے اور بقیہ عمر اس پر مداومت کرتے تھے۔ فقط نماز روزہ، پر بدون اس ملکہ کی تحصیل کے قناعت کئے ہوئے نہ تھے جیسا کہ اب ہے بلکہ جب تک یہ ملکہ ان کو حاصل نہ ہو جاتا اس کی طلب میں گرما گرمی رہتی تھی اور جب یہ حاصل ہو جاتا تھا تو یہ نہیں کہ ان کو سکون ہو جاتے اور وہ غافل اور سست پڑ جائیں ایسا نہیں تھا بلکہ اپنے امور باطنی میں اور زیادہ مستعد اور چاق و چوبند ہو جاتے تھے ؎

مکتب عشق کا دیکھا یہ نرالا دستور
اس کو چھٹی نہ ملے جس کو سبق یاد رہے

حضرت شاہ صاحبؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ تحصیل ملکۂ راسخہ متوارث اور منقول چلا آرہا ہے جس طرح کہ نماز روزہ بلکہ کل دین منقول چلا آرہا ہے اور فرمارہے ہیں کہ لا شک فی ذلک پس یہ قطعی اور اجماعی مسئلہ ہوا ہر قرن کا

اسی سلسلہ میں کہتا ہوں کہ جس طرح یہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلسل چلی آرہی ہے اسی طرح سے اخلاق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متوارث چلے آرہے ہیں یعنی آپ کے اخلاق سے صحابہ متخلق ہوتے اور پھر ان سے تابعین اور پھر ان سے تبع تابعین اسی طرح مسلسل

لہٰذا جس طرح نسبت کی تحصیل ضروری ہے اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے اور بتائے ہوئے اخلاق کے ساتھ اتصاف بھی ضروری ہے اور میں تو اس چیز کو بہت دنوں سے سمجھ چکا ہوں بلکہ کھلی آنکھوں مشاہدہ کر رہا ہوں کہ اس زمانہ میں دین اور دنیا دونوں کی فلاح حاصل کرنے کے لئے بجز تمسک بسنۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

اور کوئی صورت نہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی پر چل کر اور اسے اختیار کرکے آج ہمیں دنیا کی بھی فلاح مل سکتی ہے ورنہ تو اہل دنیا پر فلاح کا دروازہ بند اور عافیت تنگ ہو گئی ہے اور ہوتی جائے گی۔ چنانچہ آج لوگ جو فسادِ منزل بلکہ فسادِ مدینہ کے فتنوں سے مفتون ہیں اور یہ دیکھ رہے ہیں کہ عوام کس قدر پریشان ہیں۔ خواص بھی اسی طرح سے پریشان ہیں اور اسباب راحت کے موجود ہوتے ہوئے بھی سکون معدوم ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خدائی عذاب ہے جو مخلوق پر ان کی بداعمالیوں کی پاداش میں مسلط کیا گیا ہے لہٰذا اس عذاب اور ان فتن سے خلاصی کی صورت اور تدبیر اور حضرات کے نزدیک جو ہو اس کو وہ جانیں مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ سارا فساد اور نظامِ عالم کی جملہ خرابیوں کی اصل یہ ہے کہ فلاح عالم کے خدائی اصول اور صلاحِ عالم کے نبوی طریق کا رشتہ ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے اور وہ رشتہ یہی تھا کہ علاوہ دین کے دنیوی امور میں بھی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی سنن کے ساتھ تسنن کیا جاتا (چنانچہ اس کے مخاطب وہی حضرات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں اور آپ کی تعلیمات میں آپ کی تصدیق کرتے ہیں) یہ نقلاً تو ثابت تھا ہی کیونکہ یہ بھی ان امور میں سے ہے جو متوارث چلے آرہے ہیں علاوہ ازیں عقلاً بھی، ہم آج اپنے حالات میں اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں نہایت افسوس ہے کہ جو چیز اس درجہ ضروری تھی وہ متروک ہی نہیں بلکہ اس کا انکار ہو رہا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون نماز روزہ باقی ہے اور یہ چیز باقی نہیں خون کے آنسو اس پر بہائے جائیں تو کم ہے کیا فقط نماز روزہ ظاہری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے چلا آرہا ہے؟ خشک ہی۔

اس میں یہ برکات نہیں تھے یہ کیا خربط ہے یہ کہاں سے آیا؟ علماء نے اس کی تحصیل کو ضروری نہیں سمجھا اس لئے اس کا علم اور عمل ختم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہاں ایک بات یہ سمجھ لیجئے کہ حضرات صحابہ حسب مراتب سب کے سب اس نسبت کے حامل تھے اور ان کا باہمی تفاضل اور ان کے درجات کا تفاوت اسی نسبت کے تفاوت سے تھا جسے جس قدر زیادہ اور قوی نسبت حاصل ہوتی تھی اسی قدر وہ افضل اور بلند مرتبہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ نماز وروزہ ان کا عملِ ظاہر تھا اور یہ نسبت اس کا باطن تھا اور یہ حضرات اس ظاہر وباطن دونوں ہی کے جامع تھے اب صرف ظاہر دین تو کچھ ہے بھی مگر باطن اور روح ختم ہو چکی ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ اس نسبت کے الوان اور طرق مختلف ہوتے ہیں تو اس کے متعلق یہ سمجھئے کہ سلف میں اس نسبت کی تحصیل کا طریق احکام شرعیہ کی پابندی تھی اور خلف میں اشغال وغیرہ اس کے لئے مقرر ہوئے مگر احکام شرعیہ ہر حال میں مقدم رہے۔

یعنی حضرات صحابہ تو اس نسبت کو مواظبت علی الصلوٰۃ وتسبیحات اور مواظبت علی الطہارۃ، مراقبۂ موت اور ثواب مطیعین اور عذاب عاصین کے استحضار وغیرہ سے حاصل کرتے تھے اور بعد کے مشائخ نے لوگوں کی استعداد کو ضعیف پایا اور یہ دیکھا کہ محض ان امور کے کرنے سے اب یہ نسبت حاصل نہیں ہو رہی ہے تو انہوں نے اشغال ومراقبات کا اضافہ کر دیا۔ اور ان کے ذریعہ نسبت پیدا کرنی چاہی یہ تو طرق کا اختلاف ہوا۔ اور الوان کا اختلاف یہ تھا کہ مثلاً کسی نسبت میں محبت وشوق کا غلبہ ہوا

اور کسی میں خوف کا کسی میں فناء کا غلبہ رہا اور کسی میں بقاء کا تو بظاہر نسبت کے یہ سب الوان مختلف معلوم ہوتے تھے لیکن ان سب نے ہر ہر سالک کے اندر وہی حالت پیدا کر دی جس کا نام نسبت تھا چنانچہ جس میں محبت اور شوق کا غلبہ ہوا اس نے بھی معصیت کو ترک کیا اور اپنے تمام امور میں حق تعالیٰ کی رضا پیش نظر رکھی اور جس کے اندر خوف کا غلبہ ہوا اس نے بھی معاصی سے نفرت اور طاعت سے رغبت کی، یہی حال اور دوسرے الوان کا بھی ہوا۔ پس اس اختلاف کے باوجود مرجع سب کا واحد ہی رہا یعنی ارتباط باللہ تعالیٰ، جس کی تحصیل سب پر لازم تھی اور ہر شخص پر ضروری تھی، ان اشغال کے ذریعے نسبت کی تحصیل اور اس پر مواظبت اور اس میں استغراق اس درجہ کہ نفس ملکۂ راسخہ کا کسب کر لے اس لئے ضروری ٹھہری کہ جب نفس کو ملکۂ راسخہ حاصل ہو جائے گا تو پھر غفلت اور ذھول کی گنجائش باقی نہ رہ جائیگی اور اسی میں اس کی خیریت بھی ہے۔ کیونکہ اگر ان اشغال کے ذریعے ملکۂ حسنہ طیبہ کا کسب نہ کیا گیا جس سے کہ طاعت میں سہولت اور معصیت سے نفرت ہو جائے تو اشغال دنیویہ میں انہماک کے سبب سے نفس ملکۂ خبیثہ سیئہ کسب کر لے گا جس سے نجات ملنی دشوار ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ یہ ظاہری طاعات (یعنی نماز روزہ) بھی اس کو اس سے نہ نکال سکیں گی۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ سب طاعات بھی کرتا رہیگا اور دوسری جانب اس کے نفس میں یہ ملکۂ خبیثہ موجود رہیگا جس سے خلاصی آخرت ہی میں ہو سکے گی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے نسبت کی توضیح اور اس کی ضرورت آپ کو معلوم ہو گئی، نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسی نسبت کا دوسرا نام سکینہ بھی ہے یہ مشائخ کی اصطلاح ہے باقی علمائے ظاہر بھی جو معنی نسبت، سکینہ کے بیان

کرتے ہیں وہ اسی کے قریب قریب ہے چنانچہ صاحب روح المعانی فانزل اللہ سکینتہ کے تحت لکھتے ہیں کہ وھی الطمانینۃ التی یسکن عندھا القلوب یعنی سکینہ اس اطمینان کا نام ہے جسے پاکر قلوب تسکین حاصل کریں۔ اور پھر کچھ دور کے بعد باب الاشارہ میں لکھتے ہیں کہ

ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المؤمنین۔ الآیۃ۔ وکانت سکینتہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کما قال بعض العارفین من مشاھدۃ الذات و سکینۃ المومنین من معاینۃ الصفات۔

حق تعالیٰ کے ارشاد ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المؤمنین میں جو سکینہ آیا ہے اس کے متعلق بعض عارفین یہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکینہ آپ کا مشاہدۂ ذات تھا اور مؤمنین کا سکینہ صفات کا معائنہ تھا یعنی آپ اس حالت میں حق تعالیٰ کی ذات کے مشاہدہ سے متلذذ تھے اور مؤمنین اللہ تعالیٰ کی صفات کا مراقبہ کرکے مطمئن تھے۔

آگے فرماتے ہیں کہ:-

ولھم فی تعریف السکینۃ عبارات کثیرۃ متقاربۃ المعنی فقیل ھی استحکام القلب عند جریان حکم الرب بنعت الطمانینۃ لخمود

مشائخ کے سکینہ کی تعریف کے بیان میں مختلف تعبیرات ہیں عنوان مختلف ہیں لیکن معنی اور معنون قریب قریب سب کا ایک ہی ہے چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ سکینہ اس قوت قلبیہ کا نام ہے جس میں اطمینان کی آمیزش ہو حق تعالیٰ

اٰثار البشرية بالكلية والرضا بالبادی من الغيب من غير معارضة واختيار ؛

کے حکم سننے کے وقت اور اس کی وجہ سے انسان کے بشری تقاضے بالکلیہ سوختہ ہو جائیں اور پردۂ غیب سے جو چیز بھی ظاہر ہو بغیر کسی معارضہ کے اور بدون اپنا اختیار چلائے ہوئے انسان اس پر راضی ہو۔

وقيل هی القرار علی بساط الشهود وبشواهد الصحو والتأدب باقامة صفاء العبودية من غير لحوق مشقة ولا تحرك عرق بمعارضة حكم وقيل هی المقام مع الله تعالیٰ بفناء الحظوظ ؛ (روح المعانی ص ۹۴ ج ۱۰)

اور ایک قول یہ ہے کہ سکینہ اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ حق تعالیٰ کے مشاہدے کی بساط پر فائز ہو اور خالص عبودیت کی اقامت کے ادب سے متأدب ہو اس طرح پر کہ اس کو ان کی ادائیگی میں نہ تو کچھ تعب ہو اور نہ کسی حکم سے معارضہ کی رگ پھڑکے اور ایک قول یہ ہے کہ سکینہ اسے کہتے ہیں کہ انسان اپنے حظوظ کو فناء کر کے بقاء باللہ حاصل کر لے۔

اور جس طرح سے حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرات صحابہ وتابعین کے سلوک کا طریقہ اور تحصیلِ نسبت کے طرق اور ان کی تفصیل بیان فرمائی ہے اسی طرح سے حضرت مولانا گنگوہی رحؒ نے بھی نسبت احسان کے معنی بیان کئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ:-

"ہستیٔ مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر موجود جان کر حیا و شرم کے ساتھ بندۂ مطیع رہنا مقصدِ اصلی ہے اور یہی احسان ہے اور باقی زوائد"

اسی سلسلہ میں آگے صحابہ و تابعین کا سلوک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"سنو! کہ سلوک صحابہؓ و تابعینؒ و تبع تابعینؒ میں تحصیل احسان اور اپنا بندۂ ناچیز بے اختیار ہونا اور من کل الوجوہ محتاج ذات غنی کا اور حضور اس کردگار بے نیاز محسن عباد کا ہونا تھا۔ بندگی در بندگی عجز در عجز، توکل در توکل۔ ہمت اطاعت، و جان و مال کی بازی فی رضائے المولیٰ اس کا ثمرہ تھا۔ نہ استغراق تھا نہ فناء تھی ___ متاخرین نے دوسرا راستہ نکالا کہ جس سے ربط حادث بالخالق کی کیفیت معلوم ہو جائے۔ سو بعد مجاہدات معلوم ہوا کہ سب مخلوقات اعلیٰ سے اخس تک اپنے خالق سے مربوط اور اس کے وجود سے موجود ہیں بوحدتِ وجود یا بوحدت شہود علیٰ خلاف بینہم۔

پس اس ربط کے شہود کا نام جذب رکھا گیا اور انتہاء راہِ جذب اس نسبت کے انکشاف پر ہے پس جذب کے معنی رجوع السالک الیٰ حقیقۃ الحقائق و اصل الاشیاء۔ اور اس میں افناء اپنا اور اپنے علم انانیت کا کر دینا مقرر ہوئے۔

اس راہِ جذب کو جو حضرات مشائخ نے طے کیا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے گو یا وہ کمالات اب کالعنقاء ہو گئے جس طرح سالک مجاہدہ کر کے کوئی مقام طے کرے ہنوز اس کے آثار کے

سوا ان کمالات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی ان کا حوصلہ وملکہ ملاء
اعلیٰ سے ناشی تھا اب ملاء اسفل سے بھی پوری مناسبت نہیں
مع ہذا راہِ جذب ہے نہ درگاہ (یعنی جذب طریق ہے مقصد نہیں)
اس لئے بعد طے راہ جذب کے وہی طریقہ صحابہ کہ عبدیت کا مقام
ہے اختیار کرنا وعبادت وعاجزی کا معاملہ کرنا واجب ہوتا ہے"
(مکتوبات رشیدیہ صنٓ۲)

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سلوک
کی جو تفصیل بیان فرمائی بہت خوب ہے اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔
بلا شبہ حضرات صحابہ کرام رضو کا یہی حال تھا۔ لیکن حضرت نے یہ جو فرمایا کہ
وہاں نہ استغراق تھا نہ فنا تھی تو اس کی کچھ توضیح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ یہ
صحیح ہے کہ جس نوع کا استغراق اور فناء متاخرین کو حاصل ہوا حضرات صحابہ
کا فناء اس قسم کا نہ تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ حضرات فناء
سے عاری تھے ایسا نہیں تھا ان حضرات نے بھی اپنے آپ کو کامل طور پہ
فناء کر دیا تھا۔ لیکن ان کے فنا میں سکر نہ تھا کہ بالکل ہی مغلوب الحال اور
مستغرق ہو جاتے بلکہ ان کا فنا صحو کے ساتھ ساتھ تھا۔ پورے فانی اور
پوری طرح باہوش ۔ اور بعد کے لوگوں میں یہ جامعیت نہ تھی بلکہ ان کے
فنا میں سکر کا انداز تھا۔ آپ کے سامنے صحابہ کے فنا کی ایک مثال بیان
کرتا ہوں ۔

وہ یہ کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم
کے متبنیٰؓ تھے ان کا نکاح حضرت زینب کے ساتھ ہوا تھا لیکن مزاج
کی موافقت نہ ہوئی اور حضرت زیدؓ نے حضورؐ سے شکایت کی اور کہا کہ

میں ان کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا اور یہ فرمایا کہ اس نے میری خاطر سے اور اللہ اور رسول کے حکم سے تم کو اپنی طبیعت کے خلاف قبول کیا ہے اس لئے اب چھوڑ دینے کو وہ اور اس کے عزیز اپنی دوسری ذلت سمجھیں گے اس لئے خدا سے ڈرو اور جہاں تک ہو سکے نباہ کی کوشش کرو لیکن موافقت نہ ہونی تھی نہ ہوئی اور آئے دن جھگڑے اور قضیے پیش آتے رہے ادھر اللہ کو یہ منظور تھا کہ جاہلانہ رسم یعنی اپنے لے پالک کی بیوی کے ساتھ نکاح نہ کر سکنا اس کو اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے عملی طور سے ہدم کر دے تاکہ مسلمانوں کو آئندہ اس مسئلہ میں کسی قسم کا توحش باقی نہ رہے اس لئے جب زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی اور عدت گذر گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینبؓ کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان ہی پر کر دیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝

یعنی پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے نکاح کے بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ ان سے اپنا جی بھر چکیں اور خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی۔ (بیان القرآن ص ۵۱ ج ۹)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ حضرت زینب کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو یہ آیت سنائی اور پھر اس کے بعد ان کا شمار ازواج مطہرات میں ہونے لگا۔

یہ واقعہ صحابہ کرام کے سامنے پیش آیا اور اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ عجیب واقعہ تھا مگر وہ حضرات اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں اس طرح فنا کر چکے تھے کہ اس کے متعلق زبان سے کچھ کہنا تو درکنار کسی کو خطرہ اور وسوسہ کے درجہ میں بھی کوئی خیال نہیں گذرا۔ اس کی کوئی نظیر غیر صحابی میں تو مل ہی نہیں سکتی اب اس سے بڑھ کر کیا فنا ہوگی کہ اپنی رائے کو اللہ اور رسول ؐ کی رائے اور ارادہ کے بالکل تابع کر دیا تھا اور فناء سے مراد حضرات مشائخ کی بھی ارادہ ہی کا فنا ہوتا ہے یا رذائل کا فنا ہوتا ہے چنانچہ یہاں ان دونوں ہی کا بے مثال ثبوت موجود ہے۔

اسی طرح سے حضرت مولانا گنگوہی رحؒ نے جذب (یعنی نسبت) معنیٰ یہ بیان فرماتے ہیں کہ رجوع السالك الیٰ حقیقۃ الحقائق و اصل الاشیاء اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ اس میں افناء اپنا اور اپنے علم و انانیت کا کر دینا مقرر ہوئے۔ نہایت عمدہ بات فرمائی۔ بلاشبہ نسبت میں فناء علم اور فناء ارادہ تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلقات سے بھی دل سرد ہو جاتا ہے اور سالک کا مطلوب صرف ذاتِ باری تعالیٰ اور رضائے باری تعالیٰ ہو جاتا ہے اس مضمون کو حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ خلف الرشید حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ نے اپنے مکتوبات میں خوب خوب بیان فرمایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ طریق کو سالک کی نگاہوں میں محبوب کر دینے اور اس کی صعوبتوں کو برداشت کرنے اور حق تعالیٰ کی طلب میں سالک کو کھڑا کر دینے کا ان بزرگ کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ فنا کے مضمون کو تو اس دلکش عنوان

سے بیان فرماتے ہیں کہ بس انسان کمرِ ہمت کس کر میدان میں کود ہی پڑے۔
چنانچہ مکتوب بست دوم مکتوبات جلد سوم میں صوفیائے کرام کے طریق کی
مدح فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:-

الله تعالیٰ بہ جمعیت و عافیت دارد
وبر جادۂ شرع محمدی علیہ السلام
وسنت احمدی مستقیم و مستدیم
گرداند و از تعلقاتِ دنیا و گرفتاری
ماسوا محرر ساختہ در سرادقاتِ معرفت
وسراپردۂ قرب خویش اُنس و
اُلفت دہد۔ این معنی در عالمِ
اسباب وابستہ بسلوکِ طریقہ
صوفیہ عالیہ است این بزرگواران
در محبت حق جل وعلا از خود واز
غیر خود گسستہ اند و در عشق او
از آفاق وانفس گذشتہ
ماسوا را در راہِ او درباختہ و باو
ساختہ اند اگر حاصل دارند اورا
دارند اگر واصل اند باو واصل
اند باطن شاں را بہیچ انقطاع
از دونِ او تعالیٰ روئے دادہ است
کہ اگر سالہا یاد ماسوا نمایند۔ بیادِ

اللہ تعالیٰ تم کو جمعیت خاطر کے ساتھ عافیت
رکھے اور شریعت محمدی اور سنت احمدی
علیہ السلام پر مستقیم و مستدیم رکھے اور دنیوی
تعلقات سے دور اور ماسوی اللہ کے
علائق سے نفور رکھے اور اپنے قرب و معرفت
کے سراپردہ کے ساتھ انس و محبت بخشے (یہ
سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قربِ خاص جس
کا نام نسبت ہے) یہ چیز اس عالم اسباب
میں حضرات صوفیہ علیہ ہی کے طریق پہ
چلنے سے حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ ان
بزرگوں نے حضرت حق جل وعلا کی محبت
میں نہ اپنے کو دیکھا اور نہ غیر کو بلکہ سب سے
یک لخت خالی ہو گئے اور عشق مولیٰ
میں اپنے نفس کو بلکہ سارے ہی جہان
کو چھوڑ دیا اور ماسوی اللہ کو اللہ کے
راستہ میں خیرباد کہہ کر خود کو ان کے ساتھ
واصل کر لیا۔ اس طرح سے کہ اب اگر
کسی سے تعلق رکھتے ہیں تو اسی سے تعلق

شاں نیائید و از انانیتِ نفس بوعے
گذشتہ اند کہ عود کلمہ انا را بر خود
شرک می دارند "رجال صدقوا
ما عاھدوا اللہ علیہ" و "رجال
لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع
عن ذکر اللہ" خداوندا مرا
ازیں قوم بگرداں یا از نظارگیانِ
ایں قوم بگرداں کہ قوم دیگر را طاقت
ندارم
ہر کس کہ ہوس ایں راہ دارد و تخم
ایں اندیشہ در دل می کارد باید کہ
ہمہ چیز را گذاشتہ صحبتِ ایں اکابر
اختیار نماید و جاں نثار لوازم طلبگاری
کند و از ہر جا بوے ازیں دولت
بمشام جاں برسد از پئے آں شود
خوش گفت بود ـــ
بعد ازیں مصلحت کار دراں می بینم
کہ روم بر در میخانہ و خوش بنشینم

مکتوبات ص ۴۸ ج ۳

رکھتے ہیں اور کسی سے واصل ہیں تو اسی سے
واصل ہیں چنانچہ ان حضرات کے باطن
کو ما سوی اللہ سے ایسا انقطاع کلی
ہو جاتا ہے کہ اب اگر ما سوی کو سالہا
سال یاد کریں تب بھی یاد نہ آوے اسی
طرح سے نفس کی انانیت اور رعونت سے
ایسا نکل جاتے ہیں کہ اب اس کے بعد
لفظ اَنَا کا استعمال بھی ان کو شرک
معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں
نے اللہ تعالیٰ سے جو عہد باندھا تھا اس
کو سچ کر دکھایا اور یہ وہ لوگ ہیں جنہیں
تجارت اور بیع اللہ تعالیٰ کے ذکر سے
مشغول نہیں کرتی۔ خداوندا تو مجھے بھی
اسی قوم میں سے کر دے یا کم از کم ان
کی زیارت کرنے والوں ہی میں سے
بنا دے کیونکہ ان دو کے علاوہ تیسری قوم
میں ہونے کی طاقت نہیں رکھتا اب
جو شخص کہ طریق میں داخل ہونے کی
ہوس رکھے اور طلب خدا کے خیال کا بیج
اپنے دل میں بونا چاہے تو اس کو لازم ہے
کہ تمام چیزوں کو ترک کر کے مشائخ طریق

کی صحبت اختیار کرے اور لوازم طلب
کے آگے اپنی جان نثار کر دے اور جس جگہ
سے بھی اس دولت کی خوشبو اس کے
مشام جان میں پہنچے اس کی تحصیل کے
در پئے ہو جائے کسی نے خوب کہا ہے
اب اس کے بعد مصلحت کار اس میں
سمجھتا ہوں کہ مے خانہ کے دروازے پر
جا پڑوں اور خوشی خوشی وہیں ایام گذار
دوں - وقیل فی ھذا المعنیٰ
مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یاری گیرند

ایک دوسرے مقام پر قبض و بسط پر جو کہ سالک کے احوال میں سے ہیں اور طریق کے ارکان میں سے ہیں کلام کرتے ہوئے نسبت کے متعلق فرماتے ہیں کہ کبھی اس کا ضعف سالک کے قبض کا سبب ہو جاتا ہے - چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

گاہ بود کہ ایں بستگی بجہت ضعف
نسبت باطن باشد و چوں نسبت
قوت پیدا نہ کردہ است گاہے ظہور
می کند و گاہے مستور می شود
در حالت بعد صوری و غیبت از مرشد
پیش از ملکہ نہ شدن نسبت ایں
ضعف روئے می دہد و علاج

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قبض کا منشاء
نسبت باطنی کا ضعف بن جاتا ہے
کیونکہ نسبت جب قوی نہیں ہوتی تو
کبھی اس کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی وہ
مستور ہو جاتی ہے بالخصوص اس حالت
میں جب کہ اپنے شیخ سے صوری اور ظاہری
بعد بھی ہو - چنانچہ جب تک نسبت کا رسوخ

آں صحبت راہبر است و توجہ او
تا نسبت قوت پذیرد و ملکہ شود
و لبسر حد فنا رسد
(مکتوبات معصومیہ صہ ۱۶۴)

نہ ہو جائے یعنی وہ ملکہ نہ بن جائے۔
اس سے پہلے شیخ سے جدائی اس قسم
کے ضعف کا سبب بن جاتی ہے یعنی
جب شیخ کی خدمت میں رہیگا تو نسبت
میں قوت محسوس ہو گی اور جدا ہونے
میں اس میں ضعف ہو جائے گا اس کا
علاج رہبر کامل کی صحبت اور اس کی
توجہ ہے تاکہ نسبت قوی ہو کر ملکہ راسخہ
ہو جائے اور سالک فناء کی حد تک
پہنچ جائے۔

اس کے بعد توجہ شیخ اور صحبت کامل کو مدار کار (یعنی حصول نسبت اور ذریعہ تقویت نسبت) قرار دے کر اس پر نہایت ہی زور دار کلام کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ نسبت کسی صاحب نسبت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں :-

توجہ مرشد در صورت ثانیہ
کہ بواسطۂ زلت ظلمتے طاری شدہ
باشد نیز نافع است توجہ پیر کامل
کوہ کوہ ظلمات و کدورت را از ہر
راہ کہ پیدا شدہ باشد از مرید صادق
برمیدارد و تطہیر باطن او میفرماید
و در قبض نیز ایں توجہ سود مند است

مرشد کامل کی توجہ دوسری صورت میں
بھی یعنی جبکہ کسی معصیت یا لغزش کے
سبب نسبت میں تاریکی آجائے نافع
ہوتی ہے اس لئے کہ شیخ کامل کی
توجہ ایسی چیز ہے کہ اگر ظلمت و کدورات
کے پہاڑ کے پہاڑ ہر طرف سے
نمودار ہو جائیں تو ان کو بھی مرید صادق

نمودے در بسط می آرد و راہ ترقی را بروے می کشاید۔

سے دفع کر کے اس کے باطن کی تطہیر کر سکتی ہے۔ اسی طرح سے شیخ کی یہ توجہ سالک کے لئے حالت قبض میں بھی مفید ہے چنانچہ بہت جلد اس میں بسط پیدا کر کے ترقی کا راستہ اس پر کھول سکتی ہے۔

وبالجملہ مدار کار بر صحبت و توجہ است کہ با محبت و سپرد جمع شود از یک جانب محبت و سپرد و از جانب دیگر توجہ۔

حاصل کلام یہ کہ مدار کار دو صحبت اور وہ توجہ ہے جو کہ محبت یعنی عقیدت اور سپردگی کے ساتھ جمع ہو جائے یعنی سالک کی جانب سے محبت اور حوالگی ہو اور شیخ کی جانب سے توجہ۔

محبت تنہا بے توجہ راہبر می تواند کہ نافع شود و ترقی بخشد اما توجہ محض بے محبت قلیل النفع است۔

چنانچہ تنہا محبت بدون توجہ شیخ کے بھی رہبر بن سکتی ہے یعنی نافع ہو سکتی ہے اور ترقی دے سکتی ہے مگر محض توجہ شیخ بدوں محبت طالب کے کچھ زیادہ نفع بخش نہیں

محبت است کہ معانی خفیہ پیر را جذب می نماید و کمالات مخصوصہ او را بخود می کشد و فنا فی الشیخ بلکہ فنا فی اللہ پیدا می آرد و چوں از طرفین صفات مذکورہ پدید آید امید است

یہ محبت ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ تنہا شیخ کی توجہ باطنی کو جذب کر لیتی ہے اور اس کے مخصوص کمالات کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے اور فنا فی الشیخ بلکہ فنا فی اللہ کا مقام حاصل کرا دیتی

کہ راہِ ترقی کشادہ شود و بزودی بمنزل مقصود برسد و درراہ نماند۔

ص ۱۶۵

ہے اور اگر صفات مذکورہ یعنی محبت و توجہ جانبین سے ظاہر ہوتی ہیں تو اب حصول نسبت کے بعد امید قوی ہوجاتی ہے کہ ترقی کا راستہ کھل جائے اور جلد ہی منزل مقصود تک رسائی ہوجائے اور سالک راستہ ہی میں نہ رہ جائے

پھر آگے کچھ دور کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

پس باعثِ توقفِ سالک و سدِ راہ او دریں طریق ہیچ نہ شد غیر از سستی طالب، طالبِ صادق کہ در صحبت کامل افتد و شرائط طلب کہ اکابر قرار دادہ اند بجا آورد امید است کہ البتہ واصل گردد۔

(مکتوبات معصومیہ ص ۱۶۶)

پس اس طریق میں سالک کے توقف کا سبب اور اس کے حق میں مانع اور سدِ راہ کوئی اور چیز نہیں ہے بجز سالک کی سستی کے چنانچہ جو طالب صادق کسی کامل کی صحبت میں پہنچ جائے اور وہ تمام شرائط بجالائے جنہیں اکابر طریق نے مقرر کیا ہے تو امید ہے کہ ضرور بالضرور واصل ہوجائے۔

اس میں اس امر پر تنبیہ فرمائی کہ شیخ کامل کو پاکر بھی اگر سالک کامیاب نہیں ہو رہا ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ خود اس کے اندر کوئی علت اور مانع موجود ہے۔ اور علی العموم وہ مانع طالب کی کاہلی اور سستی اور اس کا شرائط طلب کا نہ بجالانا ہوتا ہے۔

ایک اور مقام پر سلوک کا مقصود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

مقصود از سیر سلوک شیخ و مرید گرفتن

سیر و سلوک سے مقصود پیر بننا اور مرید بنانا

نیست مقصود ازاں ادائے وظائف بندگی است بے منازعتِ نفس ۔

نہیں ہے بلکہ وظائف بندگی کا اس طرح سے ادا کرنا ہے کہ نفس کی آمیزش اور منازعت باقی نہ رہے ۔

و نیز مقصود نیستی و گمنامی است وزوال رعونت وانانیت امارہ کہ معرفت بداں مربوط است ہر کہ بایں کس رجوع می کند وانابت می آید اورا از حق باز داشتہ بخود مشغول می سازد و ہر کہ رجوع نمی آرد اورا بحق می دارد و ممنون او باید شد

اسی طرح سے طریق کا مقصود نیستی اور گمنامی کی تحصیل اور نفس کی سرکشی اور خود رائی کو دور کرنا ہے اس لئے کہ معرفت کا حصول اسی کے ساتھ وابستہ ہے اور جب ایسا ہے تو جو شخص ایسے شخص کی جانب رجوع ہو اور اس سے تعلق کا اظہار کرے تو اس نے گویا اس کو حق تعالیٰ کی جانب سے پھیر کر اپنی جانب مشغول کر لیا اور جو شخص ایسے شخص کی جانب رجوع نہیں کرتا تو وہ اس کو حق تعالیٰ کے ساتھ رہنے کا موقع دیتا ہے لہٰذا اس کا شکر گذار ہونا چاہیئے

سے

یارب ہمہ خلق را بمن بدخو کن
واز جملہ جہانیاں مرا یک سُو کن
روئے دلِ من صرف کنی از ہر جہتے
در عشق خودم یکجہت و یکرو کن

اے اللہ تو ساری مخلوق کو مجھ سے برگشتہ کر دے ۔ ایسا کہ وہ میری جانب رُخ ہی نہ کریں اس طرح سے مجھے تمام دنیا والوں سے یکسو فرما دے ۔ اور میرے دل کو ہر طرف سے پھیر دے ۔ اور اپنے عشق میں مجھے یکسو اور ہمہ تن متوجہ فرما دے ۔

(مکتوبات معصومیہ صـ ۶۸)

اس مکتوب میں حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ نے اس امر پر تنبیہ فرمائی ہے کہ سیر و سلوک کا مقصود یہ نہیں ہے کہ سالک بس پیری مریدی کرنے لگے اور اسی کو سلوک کا منتہیٰ سمجھ لے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ نفس کی منازعت و انانیت کو ترک کر کے وظائف بندگی کو ادا کرے اور حقوق عبودیت کو بغیر مشارکت نفس کے انجام دے۔ چونکہ وظائف بندگی و عبودیت کا ذکر آگیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کچھ وضاحت کی جائے تو اس کے شیخ ابو سعید کا کلام نقل کیا جاتا ہے وھو ھذا۔

شیخ ابو سعید فرمودہ کہ سمعت الشیخ ابا الفضل محمد بن الحسن شیخ وقتہ الماضی لا یذکر و المستقبل لا ینتظر و ما فی الوقت یعتبر و ھذا صفة العبودیة ثم قال حقیقة العبودیة شان الافتقار الی اللہ تعالیٰ و ھذا من اصل العبودیة و حسن القدوة برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ھو الذی لیس فی النفس نصیب و لا راحة۔

حضرت شیخ ابو سعیدؒ نے فرمایا کہ میں نے شیخ ابو الفضل محمد بن حسن سے سنا جو کہ اپنے وقت کے شیخ تھے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ گذرے ہوئے کو یاد نہ کرنا چاہیئے اور آئندہ کا انتظار نہ کرنا چاہیئے بس موجودہ حال کا اعتبار کرنا چاہیئے (اور اس کو غنیمت سمجھنا چاہیئے) اور یہی عبودیت کی صفت ہے پھر یہ فرمایا کہ عبودیت کی حقیقت دو چیزیں ہیں ایک تو افتقار الی اللہ تعالیٰ ہے اور یہی اصل بندگی اور اس کا اہم جزء ہے اور دوسری چیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا نہایت حسن و خوبی کے ساتھ (یعنی اس سے مقصود امتثال اور فرمانبرداری ہو) نفس کا حظ اور اس کی

راحت مطلوب نہ ہو۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ پہلے یہ سمجھئے کہ ہر شے کی ایک صفت ہوتی ہے اور اس کی ایک حقیقت اور ماہیت ہوتی ہے۔ صفت ایک خارجی چیز ہوتی ہے اور وہ چیز اسی صفت سے پہچانی جاتی ہے۔ صفت ذات سے منفک ہوتی ہے اور حقیقت عین شے ہوتی ہے جو کبھی منفک نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ ذاتیات کا ذات سے انفکاک محال ہوتا ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب سنئے کہ عبودیت کی صفت یہ ہے کہ عبد ماضی و مستقبل سے قطع نظر کر کے مافی الوقت کا وظیفہ خواہ وہ جوارح سے متعلق ہو یا قلب سے، ادا کرتا ہے۔ یعنی عبادات، معاشرت، معاملات، اخلاق، غرضیکہ جملہ طاعات میں سے جس کا وقت آئے اس کو فوراً ادا کر لے۔ اگر کبھی کہیں لغزش ہو جائے فوراً توبہ کر لے۔ اسی کو کہا گیا ہے سہ

صوفی ابن الوقت باشد اے رفیق   نیست فردا گفتنش شرط طریق

اس کی مزید وضاحت اس عبارت سے ہوتی ہے کہ :۔

حالات کی چار قسمیں ہیں نعمت، مصیبت، طاعت، معصیت، اس لئے کہ بندہ ان چار حالتوں میں سے کسی نہ کسی حال میں ضرور ہوگا۔ یا تو نعمت میں ہوگا یا مصیبت میں، یا عبادت میں یا معصیت اور ان چاروں حالتوں کے جو حقوق ہیں وہ حقوق اوقات کہلاتے ہیں۔ نعمت کا حق شکر، مصیبت کا حق صبر، عبادت و طاعت کا حق اللہ تعالیٰ کے فضل کا مشاہدہ، اور معصیت میں توبہ و استغفار و ندامت، پس کوئی وقت ایسا نہ نکلے گا کہ اس میں بندہ کے ذمہ حق نہ ہو، تو اگر یہ حقوق قضا ہو جاویں تو ان کی قضا ممکن نہیں ہے اس لئے کہ قضا کی حقیقت تو یہ ہے کہ عبادت کا جو اصلی وقت ہے وہ فوت ہو گیا ہے اب ہم اپنے پاس سے وقت خرچ کر کے اس عبادت کو ادا کریں اور یہاں یہ صورت

ممکن نہیں اس لئے کہ جس وقت کو تم نے ان حقوق کی قضاء کے لئے تجویز کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا حق جدید اور امر محکم یعنی عبادت لازم ہے۔ اس لئے کہ اس وقت میں بھی چار حالتوں میں سے کوئی حالت ہوگی اور حقوق وقت میں سے کوئی حق اللہ کا مثل صبر و شکر وغیرہ کے اس میں بھی لازم ہوگا اور جب اللہ کا حق جو اس وقت کے متعلق ہے تو اس میں ادا نہیں کر سکا تو غیر کا حق جو اس وقت کے سوا جو دوسرا وقت گذر گیا ہے جس کا وقت تو نے فوت کر دیا ہے اس کا حق اس وقت میں کیسے ادا کریگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت کے اندر تم نے پہلے وقت کا حق قضا کرنا تجویز کیا ہے اس وقت کا بھی تو حق ہے جب تم اس کو ادا کرو گے تو غیر وقت کا حق اس میں کیسے ادا کر سکتے ہو اور اگر غیر وقت کا حق ادا کرو گے تو اس وقت کا حق فوت ہو جائے گا۔ غرض اس کی قضا کسی طرح ممکن نہیں۔ پس بندہ کو لازم ہے کہ حقِ وقت کو فوت نہ کرے بلکہ ہر سانس پر حق وقت کو ادا کرتا ہے۔ اگر نعمت ہے تو شکر میں قلب کو مشغول کرلے اور اگر مصیبت ہے تو صبر میں لگے اور اگر عبادت و طاعت ہے تو اللہ کے فضل و احسان کا مشاہدہ کرے اور اگر معصیت کی حالت ہے تو ندامت اور استغفار میں مشغول ہو۔ اسی واسطے بزرگوں نے کہا ہے کہ صوفی ابن الوقت ہوتا ہے اور ابن الوقت ہونے کے یہی معنی ہیں کہ حقوقِ وقت ادا کرے۔ (اکمال الشیم ص ۳۸)

یہاں تک تو گفتگو صفتِ عبودیت سے متعلق تھی اب حقیقت عبودیت کو سمجھئے وہ یہ کہ یوں تو بندہ ہمہ وقت ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے ہی۔ یعنی کھانے میں، پینے میں، چلنے میں، پھرنے میں، صحت میں، مرض میں، یسر میں، عسر میں، غرضکہ ہر ہر قدم پر اس کو افتقار ہے، اسی افتقار کا ہمہ وقت استحضار یہی حقیقت عبودیت ہے، افتقار و احتیاج تو سبھی لوگوں کو ہوتی

ہے مگر غافلین و منکرین کو اس کا استحضار و اعتراف نہیں ہوتا اس لئے وہ حقیقت عبودیت سے محروم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہمہ وقت ہر چیز میں اپنے کو اللہ کا محتاج سمجھتے ہیں اس لئے ان کو حقیقت عبودیت حاصل ہے اس حقیقت عبودیت کا دوسرا جزء حسن القدوۃ برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جزاول یعنی افتقار الی اللہ اس آیت سے ماخوذ ہے یایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ ط و اللہ ھو الغنی الحمید ہ یعنی اے لوگو! تم خدا کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز خوبیوں والا ہے۔

اور دوسرا جزء اس آیت سے ماخوذ ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔

صاحب کشاف نے اس کی دو تفسیریں فرمائی ہیں ایک تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی میں اسوۂ حسنہ ہے یعنی آپ کی ذات بابرکات ہر اعتبار سے متوسیٰ اور مقتدا بہ ہے اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ آپ میں ایک ایسی خصلت ہے جس کا اقتداء اور اتباع کرنا چاہئے اور وہ مواسات بنفسہ ہے

اور دوسرے مفسرین نے بھی یہ دونوں تفسیریں نقل فرمائی ہیں۔ مگر تفسیر ثانی میں آپ کی اس خصلت اور صفت کی تعیین نہیں فرمائی۔ علامہ زمخشری نے اس کو متعین فرمادیا کہ وہ مواساۃ بنفسہٖ ہے اور مراد اس سے جانی ہمدردی کرنا ہے۔ یعنی آپ خود بنفس نفیس جہاد فرماتے تھے پھر کسی کی کیا مجال اور ہمت جو اس میں آپ کا اقتداء نہ کرے۔ چنانچہ حضرات صحابہ رضی بھی اپنے جان پر کھیل گئے اور مالی قربانیوں کے ساتھ ساتھ جانی قربانیاں بھی جیسی کچھ پیش فرمائیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ اور اس صفت میں تمام صحابہ سے بڑھے ہوئے حضرت صدیق اکبر رضی تھے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں خود ارشاد فرمایا کہ

ما احد عندی اعظم یدا من ابی بکر آسانی بنفسہ ومالہ۔ یعنی ابوبکرؓ سے زیادہ مجھ پر کسی کا احسان نہیں ہے اس لئے کہ انہوں نے اپنی جان ومال دونوں سے میری ہمدردی کی۔ سبحان اللہ اس سے کس قدر فضیلت حضرت صدیق کی مفہوم ہوئی۔

توجب حضور اقدس ؐ کی ذات شریف ہی قدوہ ہے پس ہر امر میں امت آپ کے اقتداء کی محتاج ہوگی۔ لہٰذا حقیقت عبودیت کا حصول اس وقت تک محال ہے جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء نہ کی جائے گی:

؎ پندار سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

خلاف پیمبر کسے رہ گزید   کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اس لئے کہ صفتِ افتقار میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء ضروری ولازم ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ درجہ کا افتقار الی اللہ اور احتیاج باللہ حاصل تھی جیسا کہ آپ کی دعاؤں سے ظاہر و باہر ہے۔

چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے ہیں:۔

اللھم آت نفسی تقواھا و زکھا انت خیر من زکٰھا انت ولیھا ومولٰھا دوسری دعا یہ فرماتے ہیں اللھم ان قلوبنا ونواصینا و جوارحنا بیدك لم تملکنا منھا شیئا فاذا فعلت ذلك بنا فکن انت ولینا واھدنا الی سواء السبیل۔

ان ادعیہ میں آپ غور فرمائیں کہ کس انداز سے جناب قدس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرض ومعروض فرما رہے ہیں اور اپنی احتیاج وافتقار الی اللہ کا اظہار فرما رہے ہیں کہ دوسرا کوئی اس طرح کر ہی نہیں سکتا۔ ظاہر ہے کہ آدمی اپنے نفس و اعضاء ہاتھ پیر کو اپنی ملک سمجھتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق

بھی یہ فرما رہے ہیں کہ لم تملکنا منہا شیئاً۔ یعنی آپ نے ان میں سے کسی کا ہم کو مالک نہیں بنایا اس کے بعد ان سب کی ولایت اور سواء سبیل کی ہدایت کی درخواست فرما رہے ہیں۔ یہ آپ کی انتہائی معرفت اور اعلیٰ درجہ کی انابت الی اللہ اور فناء ہے۔ صوفیہ کے کلام میں فنا کا ذکر آتا ہے اور اس وصف کو انہیں حضرات کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے مگر اس کو کوئی فنا نہیں سمجھتا حالانکہ فناء و بقاء وغیرہ احوال جو صوفیہ کو ملے ہیں وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے تو ملے ہیں اس میں بھی یہ لوگ مستقل نہیں ہیں ؎

نیا وردم از خانہ چیزے نخست　　　تو دادی ہمہ چیز ہا چیز تست

یہ باتیں ضمناً آگئی تھیں مگر تھیں مفید اور کارآمد اس لئے ان کا ذکر کیا گیا۔ اب اصل مضمون سنئے وہ یہ کہ خواجہ معصوم نے یہ فرمایا تھا کہ "مقصود از سیر و سلوک شیخی و مریدی گرفتن نیست مقصود ازاں ادائے وظائف بندگی است بے مناز عت نفس۔" تو میرے خیال میں یہ سکینہ ہی کی تعبیر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیر و سلوک سے مقصود اور اس کا منتہیٰ تحصیل نسبت ہی ہے اور جب کسی میں یہ حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ شخص خود کو فنا ہی کر دیتا ہے اور اسی میں انسان کی خیریت ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے جیسا کہ خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:۔

امید کہ آں برادر عزیز نیز بعافیت	امید کرتا ہوں کہ برادر عزیز بھی بخیریت ہونگے
باشند و بجمعیت صوری و معنوی متحقق	اور ظاہری و باطنی جمعیت کے ساتھ
بودند و از لفظ بمعنی آیند و از ظل باصل	متصف نیز الفاظ سے معنی میں اور ظل سے
گرائید و از ظل باصل شاہراہ است	اصل کی طرف آگئے ہوں گے کیونکہ ظل
و مانع از وصول باصل توجہ ظل است	سے اصل کی جانب شاہراہ لگی ہے

بجود و اعراض او از اصل و چوں بسیر
و سلوک بلکہ بمحض عنایتِ ازلی توجہ
بجود رو بزوال آرد و بجائے اعراض
اقبال باصل پیدا آید سر رشتۂ
سعادت بدست افتد و متمسک
بعروۃ وثقی گردد ؎

چوں بدانستی کہ ظل کیستی
فارغی گر مردی و ور زیستی

بعد از وصول ظل باصل و لحوقِ
آں سالک را استہلاک و اضمحلال
است و فنا نیستی و ایں معنی کمال
است در حق او کمال او در سلب
کمال است و خیریت او در انتفائے
خیریت، معرفت وابستہ بایں فنا
است و قرب منوط بایں انتفاء
اذا تجلی اللہ بشئ خضع لہ

باقی اصل تک پہنچنے میں مانع جو چیز ہے وہ
ظل کا خود اپنی جانب توجہ کرنا اور اصل
سے اعراض کرنا ہے اور اگر سیر و سلوک
کے ذریعہ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حق
تعالیٰ کی عنایت ازلی کے سبب سے سالک
کی توجہ ظل سے ہٹ کر اصل کی جانب
ہو جاوے اور بجائے اعراض کے اصل
کی جانب اقبال ہو جاوے تو سمجھنا چاہیے
کہ سعادت کا رشتہ ہاتھ لگا اور سالک
نے مضبوط کڑے کو ہاتھ سے پکڑ لیا ہی
جب تم نے معلوم کر لیا کہ کس کے ظل ہو اور تمہارا
اصل کون ہے؟ تو بس اب تم فارغ
ہو گئے مر جاؤ چاہے زندہ رہو مقصود حاصل
ہے۔

ظل جب اصل سے مل جاتا ہے اور اس کے
ساتھ پیوست ہو جاتا ہے تو سالک اپنے اندر
اضمحلال، استہلاک اور فنا اور نیستی کی
کی کیفیت محسوس کرتا ہے اور یہ چیز اس
کے حق میں کمال ہے اس لئے کہ سالک کا
کمال ہی سلبِ کمال میں ہے، اور اس کی
خیریت ہی عدم خیریت میں ہے معرفت

جس چیز کا نام ہے وہ اسی فناء سے وابستہ
ہے اور قرب اسی انتفاء سے ملا ہوا ہے
اللہ تعالیٰ کی تجلی جب کسی چیز پر ہوتی ہے
تو وہ اس کے سامنے پست اور خاضع
ہو جاتی ہے

وبعد ازاں مستعد آں می شود
کہ اورا از نزد خود حیات دہند
و باخلاق خود متخلق سازند من
قتلتہ فانا دیتہ و بتکمیل
ناقصاں بازش گردانند آیتہ
کریمہ او من کان میتا فاحییناہ
وجعلنا لہ نورا یمشی بہ
فی الناس نشان حال اوست
آں زماں نعمت در حق او تمام شود
و معنی خلافت بظہور آید ؎
ایں کار دولت است کنوں تا کرا دہند

(مکتوبات معصومیہ ص ۸۳)

اس فنا اور نیستی کے بعد نفس کے اندر
اس بات کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے
کہ اس کو اپنے پاس سے زندگی بخشیں
اور اپنے اخلاق کے ساتھ اس کو
متخلق بنا دیں۔ خود ہی ارشاد فرمایا ہے
کہ جس کو میں قتل کر دوں تو میں ہی
اس کا خون بہا ہوں اور پھر اس کے
بعد اس شخص کو ناقصوں کی تکمیل کے
لئے مقرر فرما دیتے ہیں۔ دیکھو ارشاد
فرماتے ہیں کہ ایسا شخص جو پہلے مردہ
تھا ہم نے اس کو زندہ بنا دیا اور ہم
نے اس کو ایک ایسا نور دیا کہ وہ اس کو
لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے
چنانچہ اس آیت میں اسی شخص کے
حال کی خبر ہے اب اس وقت جا کر اس کے
حق میں نعمت تمام ہوتی ہے اور خلافت کے

معنی کا ظہور ہوتا ہے یہ دولت اور
سلطنت کا کام ہے اور ایک منصب
عظیم ہے دیکھا چاہیئے کہ کب اور کسے
عنایت فرماتے ہیں۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ خلافت باطنی کس قدر زبردست منصب ہے اور اس کے کتنے شرائط ہیں اب منصب تو لینا چاہتے ہیں لیکن شرائط اور آداب نہیں اختیار کرنا چاہتے، صحیح طور پر مرید بھی نہیں ہوتے اور پیر بن جانا چاہتے ہیں ع

"ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا"

اسی طرح سے حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مقام پر نور باطن کی تحصیل کے لئے اتباع سنت کو ضروری قرار دیتے ہیں اس مسئلہ پر کتنی زوردار کلام فرما رہے ہیں۔ کسی طالب کو لکھتے ہیں کہ :-

مخدوما وحدت وکثرت ضد
یکدیگر اند طالب وحدت را ترک
کثرت ناگزیر است ہر قدر
جہات کثرت با خود دارد ہماں
قدر از وحدت حقیقی دور ومہجور
است وحدانی باید بود ہم
از روئے طلب ومحبت وہم
از روئے علم وارادت تا مناسبتی
پیدا آید ومرأت وحدت

مخدوم من! وحدت وکثرت ایک دوسرے
کی ضد ہے طلب وحدت کے لئے ترک
کثرت ناگزیر ہے جس قدر کثرت کے
علائق اپنے سے رکھے گا اسی قدر وحدت
حقیقی سے دور اور مہجور رہے گا۔
سالک کو وحدانی ہونا چاہیئے طلب
اور محبت کے اعتبار سے بھی اور علم و
ارادت کے اعتبار سے بھی تاکہ مناسبت
پیدا ہو جاوے اور آئینہ وحدت بن جائے

گردد و بتوحید حقیقی رسد ۔
التوحید اسقاط الاضافات

اوقات را بذکر و فکر معمور دارند و در تنویر باطن کوشند کہ محل نظر مولیٰ است و تنویر باطن منوط بدوام ذکر و مراقبہ است و مربوط باداۓ وظائف بندگی و اداۓ فرائض و سنن و واجبات و اجتناب از بدعات و محرمات و مکروہات ہر قدر کہ در اتباع شریعت و سنت و اجتناب از بدعت کوشیدہ آید نور باطن بیفزاید و راہے بجناب قدس بکشاید اتباع سنت البتہ منجی است و نتیجہ بخشش و رفع درجات احتمال تخلف ندارد ۔

اور توحید حقیقی تک سالک کی رسائی ہو جائے کیونکہ توحید تعلقات کے ساقط کرنے کا نام ہے ۔

اپنے اوقات کو ذکر و فکر سے معمور اور آباد رکھو اور باطن کو روشن کرنے میں کوشش کرو اس لئے کہ وہی نظر مولیٰ کا محل ہے اور یہ سمجھ لو کہ تنویر باطن کا تعلق ان امور کے ساتھ ہے دوام ذکر مراقبہ ۔ وظائف بندگی کی ادائیگی یعنی ادائے فرض و سنن و واجبات، نیز بدعات و دیگر محرمات و مکروہات سے اجتناب

چنانچہ جو شخص جس قدر بھی اتباع سنت اور عمل بالشریعۃ اور اجتناب بدعت میں زیادہ کوشش کرے گا اتنا ہی زیادہ اسے نور باطن حاصل ہوگا اور حق تعالیٰ کی راہ اس پر کھلے گی بلاشبہ اتباعِ سنت نجات دینے والی چیز ہے بہر صورت نفع بخشش اور درجات کو بلند کرنے والی اس میں خلاف کا تو احتمال ہی نہیں ۔

وما ورائے آں خطر در خطر است
وراہِ شیطان فالحذر کل الحذر
فماذا بعد الحق الا الضلال
دین قویم را کہ بوحی قطعی ثابت
شدہ است بترہات اوہام و
خیال نمی داشت برداشت
وما علی الرسول
الا البلاغ

لیکن اس کے ماسوا جو چیزیں ہیں
ان میں خطرہ ہی خطرہ ہے بلکہ وہ شیطانی
راستہ ہے لہذا ان سے بہت اجتناب
کرو اور احتیاطِ کلی رکھو اس لئے کہ حق
کے بعد بجز گمراہی کے اور رہ ہی کیا جاتا ہے
دینِ متین کو جو کہ وحی قطعی سے ثابت
ہے محض لغو باتوں اور اوہام خیالات
سے تو چھوڑا نہیں جاسکتا۔

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ کا کلام آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ سبحان اللہ کیا کلام ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طریق کو کتنا سمجھے ہوئے ہیں چنانچہ کیسا ہی کوئی شخص کم ہمت ہو حضرت کے بیان کے بعد ایک مرتبہ تو کمر ہمت کس کر راہ خدا میں کھڑا ہی ہو جائے گا۔ تاہم طریق کی غرض وغایت کی وضاحت کے سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا کلام جو کہ القول الجمیل سے نقل کیا گیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہے جس کا حاصل یہی تھا کہ سارے طرق کا مرجع ہیئتِ نفسانیہ (یعنی نسبت کی تحصیل ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کو ارتباط و انتساب حاصل ہوتا ہے

چنانچہ حضرات صوفیاء نے جو اشغال و مراقبات تعلیم کئے ان سے مقصود نفس میں اسی ملکہ کو پیدا کرنا اور راسخ کرنا تھا اگرچہ نسبت کی تحصیل کچھ ان اشغال پر بھی موقوف نہیں کیونکہ حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اس نسبت وسکینہ کو دوسرے طرق سے حاصل کیا کرتے تھے، مثلاً صلوٰۃ و تسبیحات پر حضور

قلب کے ساتھ مواظبت، نیز طہارت پر مداومت، موت کی یاد، جنت، دوزخ کا پیش نظر رکھنا اسی طرح تلاوتِ قرآن پر مواظبت اور اس کے معانی میں تدبر وغیرہ کرنا۔

غرض ان سب امور پر یہ سب حضرات ایک مدت تک مواظبت فرماتے تھے جس کی وجہ سے قلب میں ایک ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور تادمِ آخر اس کی محافظت فرماتے تھے اور یہی وہ نسبت مسلسلہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ مشائخ متوارث چلی آرہی ہے جس میں کوئی شک نہیں اسی کو شاہ صاحب نے طریق کا مرجع اور اس کا حاصل کہا ہے اور ایک اور مقام پر اس کو غنیمتِ کبریٰ فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ نسبتہائے صوفیہ غنیمتے است کبریٰ و رسوم ایشاں ہیچ نمی ارزد۔

آخر میں صوفیہ کے اشغال و مراقبات کے متعلق بھی ایک بات کہتا ہوں وہ یہ کہ یہ تو بالکل صحیح ہے کہ ان حضرات نے نسبت ہی کی تحصیل اور اس کی تکمیل کے لئے بطورِ معاونت کے اشغال وغیرہ تجویز فرمائے اگرچہ حضرات صحابہ اسی نسبت کو صرف اعمال شرعیہ ہی سے حاصل کر لیتے تھے تو جب اعمال شرعیہ کو تحصیل نسبت کے لئے بعد کے لوگوں نے کافی نہ بنایا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اشغال کی بھی ضرورت سمجھی گئی۔ کیونکہ دیکھا گیا کہ لوگوں میں نماز روزہ موجود ہے مگر نسبت غائب تو اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مشائخ نے جن چیزوں کا اضافہ فرمایا تھا اب ہو سکتا ہے کہ ان کی بھی صرف صورت ہی صورت رہ گئی ہو اور اثر اور مقصود ان سے ختم ہو چکا ہو چنانچہ اس زمانہ میں لوگوں کا حال یہی دیکھ رہا ہوں کہ طریق کی چیزوں کے صرف ظاہر کو لے رکھا ہے اور اس کے باطن سے نظر پھیرے ہوئے ہیں جس طرح سے عام لوگوں کا حال ہے کہ نماز و روزہ پر تو عمل ہے

مگر اس سے جو مقصود تھا تحصیل نسبت اور اس پر مواظبت اور اس کی محافظت ان سب باتوں کی جانب ذرا بھی توجہ نہیں اور وجہ کلی اس کی یہ ہے کہ مقصود اور غیر مقصود میں امتیاز باقی نہیں رہا۔ مقصود کو غیر مقصود اور غیر مقصود کو مقصود بنالیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی کی جزئی یہ بھی ہے کہ مشایخ کو مقصود سمجھا جاتا ہے اور ان کے پاس جو دولت ہے یعنی نسبت مسلسلہ اور نور اور سکینہ اس کی تحصیل کی فکر نہیں۔ اس زمانہ میں طریق کے اندر یہ ایک بہت بڑی بدعت داخل ہو گئی ہے جس نے طریق کو فاسد کر دیا اور وہ یہی کہ نہ مقصود کی خبر ہے اور نہ غیر مقصود کا علم اسی چیز کو آپ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ اگر اس ایک بات کو سمجھ لیجئے گا تو بہت بڑے مخمصہ سے نکل جائیے گا اور دینِ خالص سے قدر مقدر نصیب ہو ہی جائیے گا ورنہ ساری عمر بھی کہیں آئیے جائیے گا اور کچھ بھی کشود کار نہ ہو گا۔

احوالِ رفیعہ

یہاں تک تو کلام نسبت کی تشریح و تفصیل اور اس کے ذریعۂ تحصیل سے متعلق تھا اب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے دوسرے جزء کی بھی کچھ توضیح کرنا چاہتا ہوں یعنی یہ کہ مداوم علی السکینۃ کو جو احوال رفیعہ ملا کرتے ہیں وہ کیا ہیں اور اس مضمون کو میں ایک عجیب و غریب مضمون سمجھتا ہوں یوں تو یہ مضمون قرآن و حدیث میں آیا ہے اور علمائے نے بھی اس کو بیان فرمایا ہے اس لئے ایسا کچھ عجیب بھی نہیں ہے لیکن ہماری معلومات چونکہ محدود ہیں اور نظر سطحی ہے اس لئے اس کو عجیب و غریب ہی کہا جائے گا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمانے کے بعد کہ سکینہ پر مداومت

کرنے والے کے لئے کچھ حالات رفیعہ ہوتے ہیں جو اسے نوبت بنوبت ملتے ہیں پس سالک کو چاہئے کہ ان حالات کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ حالات اس کی طاعت کے عند اللہ مقبول ہونے اور باطن نفس اور سویدائے قلب میں اثر کرنے کے علامات ہیں / آگے بعض احوال رفیعہ کو شمار کرایا ہے جو کہ مداوم علی السکینہ کو حق تعالیٰ کی جانب سے مرحمت فرمائے جاتے ہیں ۔

(۱) مثلاً ایک حال اس کو یہ ملتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کو تمام ماسوا پر ترجیح دیتا ہے ۔

(۲) اسی طرح سے ایک حال اس کو یہ ملتا ہے کہ اس پر خوف وخشیت کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ قلب سے نکل کر بدن اور جوارح پر بھی اس کا اثر ظاہر ہو جاتا ہے

(۳) اسی طرح سے ایک انعام مواظب علی السکینہ کو اس دنیا میں یہ ملتا ہے کہ اسے عمدہ عمدہ خواب نظر آتے ہیں جس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ رجل صالح کا رؤیاء صالحہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت سے صرف مبشرات رہ جائیں گے صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ مبشرات کیا ہیں ؟ آپ نے فرمایا کہ اچھا خواب جسے کوئی رجل صالح دیکھے یا اس کے واسطے کسی دوسرے نیک اور صالح شخص کو دکھایا جائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کے قول لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا میں بشریٰ کی تفسیر رؤیاء صالحہ ہی سے کی گئی ہے ۔

(۴) اسی طرح سے ایک حال صاحب سکینہ کو اس دار دنیا میں یہ ملتا ہے کہ اس کو فراست صحیحہ حاصل ہوتی ہے یعنی ایسا خاطر جو واقع کے مطابق ہو۔ اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ یعنی مؤمن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

صاحب شفاء العلیل نے فراست صادقہ کے معنی لکھے ہیں کہ ٹھیک اٹکل۔ یعنی مداوم علی السکینہ کو ایک انعام یہ ملتا ہے کہ جس چیز کے متعلق غور کرنا چاہتا ہے تو اس کے قلب میں واقعہ کے مطابق القاء کر دیا جاتا ہے چنانچہ اس سلسلہ کے بے شمار واقعات ہیں جو اسلاف کے حالات میں پائے جاتے ہیں یہاں دو واقعات بیان کرتا ہوں۔

۱۔ رسالہ قشیریہ میں حضرت ابراہیم خواص کا یہ واقعہ منقول ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں بغداد کی جامع مسجد میں تھا وہاں فقراء کی ایک جماعت موجود تھی اتنے میں ایک جوان نہایت ہی ہنس مکھ باوقار، خوبصورت، اور نہایت ہی عمدہ خوشبو لگائے ہوئے سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے اپنے اصحاب سے کہا کہ میرے قلب میں یہ آرہا ہے کہ یہ شخص یہودی ہے۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ فکلھم کرھوا ذلک۔ یعنی میری بات کو تقریباً سب ہی نے ناپسند کیا تاہم میں تو یہ کہہ کر مجلس سے اٹھ گیا اور وہ جوان آیا اور حاضرین مجلس سے دریافت کیا کہ میرے متعلق شیخ نے کیا فرمایا اس پر بھی لوگوں کو ہمت شیخ کے مقولہ کو اس سے نقل کرنے کی نہیں ہوئی بلکہ اس کی ظاہری وجاہت سے مرعوب ہو گئے اس نے اصرار کیا کہ بتائیے شیخ نے کیا فرمایا ہے اس پر لوگوں کو کہنا پڑا کہ شیخ نے یہ فرمایا ہے کہ تم یہودی ہو۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی وہ جوان میرے پاس آیا اور میرے ہاتھوں پر سر رکھ دیا اور مسلمان ہو گیا کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہارے اسلام کا سبب کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ ہم اپنی کتابوں میں لکھا ہوا پاتے تھے کہ صدیق کی فراست خطا نہیں کرتی۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ مسلمانوں کا امتحان کروں گا پھر میں نے غور و تامل کیا تو یہ سمجھ میں آیا کہ اہل اسلام بھی صدیق اگر ہو سکتے ہیں تو اسی طائفہ صوفیہ ہی میں ہو سکتے ہیں اس لئے کہ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی باتیں بیان کرتے ہیں چنانچہ میں نے

تمہارے اوپر التباس کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی باوجود اس کے جب تمہارے شیخ اپنے نورِ فراست سے مجھ کو تاڑ لیا اور پہچان لیا کہ میرے اس ظاہر میں باطن کچھ اور ہے تو مجھے اب یقین ہو گیا کہ بس یہی صدیق ہیں۔ چنانچہ وہ جوان اُن کی خدمت میں رہا اور کبارِ صوفیہ میں سے ہوا۔

۲۔ اسی کے مثل ایک اور واقعہ سنئے مالابد میں کتاب الاحسان میں ہے کہ :

نورِ باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جست وبداں نور سینۂ خود را روشن باید کرد تا ہر خیر و شر بفراست صحیحہ دریافت شود (مالابدمنہ ص۱۷۳)	پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ باطن کو درویشوں کے سینے سے تلاش کرنا چاہیئے اور اس نور سے اپنے سینہ کو روشن کرنا چاہیئے تاکہ فراست صحیحہ حاصل ہو اور اس کے ذریعہ ہر خیر و شر کو معلوم کیا جا سکے۔

اس فراست صحیحہ پر حاشیہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مؤمن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے اور اس پر یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ :-

ایک شخص درویشوں کا جبہ اور دلق پہنے ہوئے حضرت خواجہ عبد الخالق غجدوانی رح کی مجلس میں آکر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا جب حضرت لوگوں کو پند و نصیحت کرنے سے فارغ ہو چکے تو اس شخص نے اٹھ کر حضرت سے یہ سوال کیا کہ اتقوا فراسة المؤمن کا کیا مطلب ہے اور وہ فراست کیا چیز ہوتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ فراست یہ ہے کہ تم اپنا زُنّار توڑ ڈالو، یہ سن کر اس نے شور مچایا اور کہا کہ معاذ اللہ مجھے زنّار سے کیا مطلب ؟ اسی اثناء میں ایک مرید نے شیخ کا اشارہ پا کر اس کے دلق ریائی کو اس کے بدن سے الگ کر دیا تو اس کے نیچے سے زُنّار نکلا یہ واقعہ دیکھ کر وہ شخص مسلمان ہو گیا۔ اصل واقعہ

تو ختم ہوا اس کے بعد شیخ نے اپنے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ دوستو!
آؤ جس طرح اس نے اپنے ظاہری زنار کو توڑا ہے اور مسلمان ہو گیا ہے یارو!
آؤ ہم سب بھی اپنے اپنے باطنی زنار کو توڑ ڈالیں اور اس وقت سے حق تعالیٰ
کے ساتھ نیا عہد باندھیں شیخ کے اس کہنے پر لوگوں کے درمیان سے ایک شور
اٹھا اور سب نے اسی وقت بیعت کی تجدید کی (حاشیہ مالا بد منہ)

سبحان اللہ! عجیب واقعہ ہے ظاہر ہے کہ پھر اس کے بعد ان لوگوں نے
کیسا کچھ عہد باندھا ہوگا۔

اجابتِ دُعا

(۶) اسی طرح سے منجملہ ان احوال رفیعہ کے جو حق تعالیٰ کی جانب سے مداوم
علی السکینہ کو مرحمت فرمائے جاتے ہیں ایک عظیم الشان حال اجابت دُعا
بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک ایسی نسبت اور ایسا
تعلق بندہ کا قائم ہو جائے کہ اب اس کے بعد اپنی جس ضرورت کو یہ طالب
اپنی جہد ہمت اور قلب کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے طلب کرے
تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیں۔ جس طرح کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ
ایک صحابی تھے جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ
مستجاب الدعوات ہیں۔ ایک مرتبہ کسی جنگ میں یہ بھی شریک تھے آسمان
کی جانب ہاتھ اٹھا کر دعا کی اسی وقت اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے دلوں
میں رعب ڈال دیا اور سب نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہ بھی اجابت دعا جو
مومن کو ملا کرتی ہے۔

۷۔ اسی طرح سے اس کو یہ مرتبہ بھی عطاء ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ پر توکل

کرکے کسی بات پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں تاکہ اس کا صدق ظاہر ہو جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رُبَّ اَغْبَرَ اَشْعَثَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَہُ لَہٗ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ ۔ یعنی بہت سے شخص غبار آلود، پراگندہ بال، پھٹے پرانے کپڑے والے جن کو کوئی خاطر میں نہ لاتا ہو (یعنی لوگوں کی نظروں میں بے وقعت ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا مرتبہ رکھتا ہے کہ) اگر اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا فرما دیں۔ مطلب یہ کہ ظاہر حال تو اس کا ایسا ردی کہ لوگ اپنے پاس بٹھانا تک گوارا نہ کریں مگر خدا کے نزدیک اس کا ایسا درجہ کہ وہ جو کچھ زبان سے نکال دے تو اس کے تعلق اور مقبولیت کی لاج رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ ویسا ہی معاملہ فرما دیں سبحان اللہ کیا مرتبہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس دار دنیا میں اپنے بندوں کو کیا کیا دیتے ہیں۔

اس توکل اور لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ ۔ کی ایک مثال حدیث شریف کے ایک واقعہ سے دیتا ہوں۔

ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میری پھوپھی رُبَیّع نے ایک باندی کے سامنے کے دانت توڑ دیئے لوگوں نے کوشش کی کہ وہ معاف کر دے مگر اس کے قبیلہ والوں نے صاف انکار کر دیا پھر لوگوں نے چاہا کہ ارش یعنی اس کی قیمت ہی لے لے اور قصاص سے باز آجاتے مگر خاندان والوں نے یہ بھی نہ مانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدمت میں مقدمہ پیش کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم شرعی یعنی قصاص کا فیصلہ فرما دیا۔ یعنی یہ کہ اس کے بدلے میں ان کے بھی دانت توڑے جائیں۔ آ کا یہ فیصلہ سن کر حضرت انس بن نضر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسو

کیا میری پھوپھی کے دانت ٹوٹ ہی جائیں گے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے اس کے دانت تو نہیں ٹوٹیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے انس کیسی باتیں کرتے ہو کتاب اللہ میں قصاص کی تصریح موجود ہے (مراد اس سے آپ کی یہ آیت تھی وَکَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ) حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ پھر اس جاریہ کی قوم راضی ہو گئی اور انہوں نے قصاص معاف کر دیا (اور میری پھوپھی کے دانت صحیح و سالم رہ گئے) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ مَنْ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کے مطابق معاملہ فرما دیں۔

میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کے بعد حضرت انسؓ کا یہ کہنا کہ دانت تو نہیں ٹوٹیں گے اللہ و رسولؐ کے حکم کا (معاذ اللہ) رد کرنا نہیں تھا بلکہ محض توکلاً علی اللہ یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید اللہ تعالیٰ خصم کو راضی فرما دیں اور وہ قصاص کو معاف کر دے ایک آئندہ ہونے والی بات کی خبر دینا تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ان احوال اور صاحب سکینہ کو مرحمت فرمائے جانے والے انعامات کا ذکر کر کے حضرت شاہ صاحب رحؒ آخر میں پھر پہلی بات کا اعادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وبالجملة فهذه الوقائع وامثالها دالة على صحة ايمان الرجل وقبول طاعاته وسراية النور فى صميم قلبه فليغتنمها۔ یعنی خلاصہ کلام یہ کہ ایسے حالاتِ رفیعہ جو مذکور ہوئے اور انہیں کے مانند اور

دیگر حالات عالیہ یہ سب دلالت کرتے ہیں کہ اس شخص کا ایمان صحیح ہے اور اس کی طاعات عنداللہ مقبول ہیں اور نور ایمان اس کے باطن میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ لہٰذا سالک کو چاہیئے کہ ان احوال کو غنیمت جانے، کیونکہ یہ سب اس کے ایمان کی دلیل اور دنیا میں بھی اس کے لئے تسلی کا باعث بن سکتے ہیں۔ ایمان کی صحت اور طاعات کا قبول ہونا یہ کیا کچھ کم مرتبہ رکھتا ہے یہ سب علامات مذکورہ اسی کی فرع ہیں۔

دیکھئے حضرت شاہ صاحبؒ نے کیسی عمدہ بات بیان فرمائی کہ اجابتِ دعا بھی انہیں احوال رفیعہ میں سے ہے جو صحت ایمان اور قبول طاعات پر ملتے ہیں اور ان کی اصل یعنی سکینہ کی تحصیل اور اس کی مداومت پر یہ عطا ہوتے ہیں جیسا کہ آپ نے صحابہ کے واقعات میں ملاحظہ فرمایا چنانچہ یہ اور اس قسم کے بیشمار واقعات اسلاف کے ایسے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے صالحین بندوں کو ان کے دوام علی السکینہ کے صلہ میں اجابتِ دعا کا مقام عطا فرماتے ہیں کس قدر قدردانی ہے ایمان مؤمن کی سبحان اللہ!

اسی مضمون کو مولانا رومیؒ رحمۃ اللہ علیہ مثنوی میں، یوں بیان فرماتے ہیں کہ

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مرادِ متقیں

یعنی تم یوں چاہتے ہو تو خدا بھی یوں ہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے متقی بندوں کی مراد پوری فرماتے ہیں۔

آخر میں ایک بات یہ کہتا ہوں کہ یہی وہ احوال تھے جن پر اہل اللہ نے دنیا کو تج دیا تھا۔ چنانچہ ان کے حصول کے بعد دنیا کی کچھ بھی وقعت اور قدر ان کے قلوب میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حضرت مولانا قدس سرہٗ کبھی کبھی مجلس میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔ اور کچھ اس ذوق سے پڑھتے تھے کہ سامعین پر عجیب کیف

طاری ہو جاتا تھا وہ شعر یہ ہے ؎

بفراغِ دل زمانے نظرے بہ ماہ روئے
بہ ازاں کہ چترِ شاہی ہمہ روز ہائے وہوئے

اس وقت آپ کے سامنے اجابتِ دعا کے سلسلہ میں چند واقعات اور بیان کرتا ہوں اور اس میں شک نہیں کہ بڑے ہی عبرت کے واقعات ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی کی دعا ضرور قبول فرماتے ہیں

رسالہ قشیریہ میں ہے کہ حذیفہ مرعشی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابراہیم بن ادہم رح کی خدمت میں بہت دنوں تک رہا۔ مجھ سے دریافت کیا گیا کہ ان کا سب سے عجیب تر واقعہ جس کا تم نے مشاہدہ کیا ہو بیان کرو۔

حذیفہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ مکہ شریف کے سفر میں تھے کئی دنوں سے کھانے کی کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی تھی کہ اسی اثناء میں ہم کوفہ پہنچے اور وہاں ایک ویران و شکستہ مسجد میں قیام کیا۔ حضرت ابراہیم بن ادہم نے میری جانب دیکھا اور فرمایا کہ حذیفہ تم پر تو بھوک کا اثر دیکھ رہا ہوں! میں نے عرض کیا کہ حضرت نے بجا ارشاد فرمایا۔ انہوں نے فرمایا کہ اچھا ذرا قلم دوات اور کاغذ تو لے آؤ۔ میں نے لاکر پیش کیا تو اس پر تحریر فرمایا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ انت المقصود الیہ بکل حال والمشار الیہ بکل معنیً۔ یعنی ہر حال میں آپ ہی مقصود ہیں اور ہر معنی سے آپ ہی مراد ہیں اور اس کے بعد یہ اشعار لکھے۔

انا حامد انا شاکر انا ذاکر — انا جائع انا ضائع انا عاری

میں آپ کی حمد کرنے والا ہوں اور آپ کا شکر کرنے والا ہوں اور آپ کی یاد کرنے والا ہوں۔ میں بھوکا ہوں میں پیاسا ہوں اور میرے بدن پر کپڑا نہیں ہے۔

ھی ستۃ وانا الضمین لنصفھا — فکن الضمین لنصفھا یا باری

یہ کل چھ چیزیں ہیں یعنی حمد و شکر، ذکر، بھوک، پیاس، عریانی، تو میں ان میں اول تین
کا ضامن ہوتا ہوں، پس اے باری بقیہ نصف کے آپ ضامن ہو جائیے۔

مدحی لغیرك لهب نار خضتها فاجر عبيدك من دخول النار

(اور آپ سے یہ درخواست اس لئے کرتا ہوں کہ میرا آپ کے علاوہ کسی اور کی تعریف کرنا گویا
آگ کی لپیٹ میں داخل ہونا ہے لہذا اپنے اس مسکین بندے کو دخولِ نار سے بچا
لیجئے۔

والنار عندی کالسوال فهل تری ان لا تكلفنی دخول النار

اور یہ میں نے دخول نار اس لئے کہا کہ کسی سے سوال کرنا میرے نزدیک بمنزلہ دخولِ
نار ہی کے ہے تو کیا آپ اپنے کرم سے مجھے دخولِ نار سے بچا لیں گے؟

یہ لکھ کر مجھے رقعہ دیا اور فرمایا کہ جاؤ اور خبردار اپنے قلب کو غیر اللہ سے متعلق نہ
کرنا اور سب سے پہلے جس شخص سے تمہاری ملاقات ہو اسے یہ رقعہ دیدینا۔ حذیفہ
کہتے ہیں کہ میں رقعہ لے کر چلا تو میری ملاقات سب سے پہلے ایک خچر سوار سے ہوئی میں نے
اسی کو وہ پرچہ دیدیا اس نے لیا پڑھا اور روتے لگا اور مجھ سے پوچھا کہ جن بزرگ نے
یہ پرچہ لکھا ہے وہ کہاں ہیں میں نے کہا کہ وہ تو فلاں مسجد میں مقیم ہیں یہ سن کر اس نے
مجھے ایک تھیلی دی جس میں چھ سو دینار تھے اور دے کر چل دیا۔ پھر میری ملاقات ایک
اور شخص سے ہوئی میں نے اس سے دریافت کیا کہ خچر پر یہ جو شخص جا رہا ہے آپ
بتا سکتے ہیں یہ کون ہے اس نے کہا کہ ہاں یہ تو ایک نصرانی ہے اس کے بعد میں حضرت
ابراہیم بن ادہم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا قصہ سنایا انہوں نے فرمایا کہ اچھا
اس تھیلی کو اسی طرح سے رہنے دو ابھی وہ خود آتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر گذری ہوگی
کہ وہ نصرانی آیا اور منہ کے بل حضرت ابراہیم بن ادہم کے سامنے گرا اور مشرف
باسلام ہو گیا۔ سبحان اللہ! ایمان تازہ کرنے والا واقعہ ہے کبھی آپ کا ایسا

بھی زمانہ تھا۔

دوسرا واقعہ سنئے۔

حضرت ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ میں ایک بستی میں پہنچا وہاں میں نے ایک نصرانی کو دیکھا جس کی کمر میں زنار بندھی ہوئی تھی اس نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اس کو بھی ہمراہ لے لوں۔ چنانچہ ساتھ ہو لیا اس کے بعد ہم دونوں سات دن تک سفر کرتے رہے پھر ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ اے اسلام کے درویش ہمیں بھوک لگی ہے۔ کچھ اپنی کرامت ظاہر فرمائیے۔ حضرت ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے اس کافر کے سامنے رسوا نہ کیجئے (اپنے فضل و کرم سے کھانا عطا فرمائیے) یہ دعا کرنا تھا کہ ایک طباق نازل ہوا جس میں روٹی، بھنا ہوا گوشت کچھ کھجوریں، اور پانی کا کوزہ رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے خوب سیر ہو کر کھایا پیا۔ اور پھر ہفتہ بھر چلتے رہے اس کے بعد اب کی دفعہ میں نے سبقت کی اور اس سے کہا کہ اے نصاریٰ کے راہب، اب تیری باری ہے تو بھی اپنی بزرگی دکھلا، یہ سن کر اس نے اپنی لاٹھی پر سر ٹیک لیا اور اللہ تعالیٰ سے کچھ دعا کی۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دو طباق رکھے ہوئے ہیں اور ان پر میرے طباق سے کہیں زیادہ کھانے پینے کی چیزیں موجود ہیں ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ مجھے یہ منظر دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور ندامت بھی (یہ خیال کر کے کہ یہ کافر سمجھے گا کہ نصرانیت اسلام سے بڑھ گئی) چنانچہ اسی رنج و غم میں میں نے کھانے سے انکار کر دیا اس نے بہت اصرار کیا مگر میں نے وہ کھانا نہیں کھایا۔ بالآخر اس نے کہا کہ میں آپ کے نہ کھانے کی وجہ سمجھ گیا ہوں، اچھا کھائیے اور آپ کو میں دو خوشخبریاں سناتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور آپ کے سامنے کلمہ اسلام پڑھتا ہوں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

واشہد ان محمدا رسول اللہ - یہ پڑھ کر زنار توڑ کر پھینک دی۔

اور دوسری خوشخبری یہ کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ، یا اللہ اگر آپ کے اس بندے کا (یعنی آپ کا) تیرے نزدیک کوئی مرتبہ ہو تو اس کی برکت سے میرے اوپر فتح فرما دیجئے (چنانچہ یہ سب جو آپ دیکھ رہے ہیں آپ ہی کی برکت ہے)

ابراہیم خواص کہتے ہیں کہ یہ سن کر ہم نے کھانا کھایا اور پھر ہم دونوں نے اپنا راستہ لیا۔

چنانچہ حج بیت اللہ کیا اور مکہ معظمہ میں ایک سال تک ہم دونوں مقیم رہے۔ پھر اس شخص کا وہیں انتقال ہو گیا اور بطحاء میں دفن ہوا۔

اسی رسالہ قشیریہ باب الدعاء میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ حضرت انس بن مالک رض روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص تھا جو بغرض تجارت بلاد شام سے مدینہ اور مدینہ سے شام کا سفر کیا کرتا تھا اور اپنے سفر میں قافلوں کے ساتھ نہیں جاتا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے تنہا سفر کیا کرتا تھا ایک مرتبہ شام سے مدینہ آرہا تھا کہ راستہ میں اس کو ایک چور ملا جو گھوڑے پر سوار تھا اس نے تاجر کو آواز دی کہ ٹھہر جاؤ تاجر ٹھہر گیا اور چور سے کہا کہ تم میرا مال لے لو اور مجھے جانے دو چور نے جواب دیا کہ یہ مال تو میرا ہے ہی میں تمہاری جان لینے کا ارادہ رکھتا ہوں تاجر نے اس سے کہا کہ میری جان لے لینے سے تم کو کیا نفع کی امید ہے میرا مال لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔ چور نے پھر وہی پہلی بات کہی، تو تاجر نے اس سے یہ کہا کہ اچھا مجھ کو اتنی مہلت دے دو کہ میں وضو کر کے نماز پڑھ لوں اور اپنے رب عزوجل سے دعا کر لوں چور نے جواب دیا کہ ہاں تم جو چاہو کر لو۔ تاجر وضو کر کے کھڑا ہوا اور چار رکعت نماز پڑھی پھر اپنا

ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی :۔

يَا وَدُوْدُ يَا وَدُوْدُ يَا ذَا الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ يَا مُبْدِئُ يَا مُعِيْدُ
يَا فَعَّالُ لِمَا يُرِيْدُ اَسْئَلُكَ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ
مَلَأَ اَرْكَانَ عَرْشِكَ وَاَسْئَلُكَ بِقُدْرَتِكَ الَّتِيْ
قَدَرْتَ بِهَا عَلٰى جَمِيْعِ خَلْقِكَ وَبِرَحْمَتِكَ الَّتِيْ
وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ لَا اِلٰهَ اَنْتَ يَا مُغِيْثُ اَغِثْنِيْ

یہ دعا اس نے تین مرتبہ پڑھی جب دعا سے فارغ ہوا تو اچانک ایک شخص نمودار ہوا۔ جو چمکتے ہوئے گھوڑے پر سوار تھا اور سبز کپڑے پہنے ہوئے تھا اس کے ہاتھ میں نور کا ایک حربہ تھا جب چور نے اس سوار کو دیکھا تو تاجر کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا جب اس کے قریب پہنچا تو اس سوار نے چور پر حملہ کیا اور نیزے سے مار کر اس کو اس کے گھوڑے سے گرا دیا ۔ پھر تاجر کے پاس آیا اور اس سے کہا کہ اٹھو اور چل کر اس چور کو تم ہی قتل کرو۔ تاجر نے اس سے کہا کہ تم کون ہو؟ میں نے تو کبھی کسی کو بھی قتل نہیں کیا اور نہ میرا جی اس کو قتل کر کے خوش ہوگا پس وہ سوار واپس لوٹ کر چور کے پاس آیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر تاجر کے پاس واپس آیا اور اس سے کہا کہ سنو میں تیسرے آسمان کا ایک فرشتہ ہوں جب تم نے پہلی مرتبہ دعا کی تو ہم لوگوں نے آسمان کے دروازوں سے حرکت کی آواز سنی اور آپس میں ہم لوگوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کوئی امر حادث ہوا ہے پھر جب تم نے دوبارہ دعا کی تو آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے اور اس سے آگ کی چنگاریوں کی طرح شرارے نکلنے لگے پھر جب تم نے تیسری مرتبہ دعا کی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اوپر سے ہمارے پاس تشریف لائے اور یہ ندا کر رہے تھے کہ :۔ من لھذا المکروب ۔ کون اس مصیبت زدہ کے کام آوے گا تو میں نے

اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ مجھ کو اس چور کے قتل کا متولی بنا دیجئے۔ اور یہ کہا کہ اے عبد اللہ تم یہ جان لو کہ جو شخص تمہاری اس دعا کو کربت اور مصیبت اور شدت کے وقت میں پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت اور پریشانی کو دور فرما دیں گے اس کے بعد وہ تاجر اپنا مال لے کر سلامتی کے ساتھ مدینہ شریف پہنچا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعہ کی نیز اس دعا کی اطلاع دی تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ لقد لقنك الله عزوجل عن اسمائه الحسنیٰ التی اذا دعی بها اجاب واذا سئل بها اعطیٰ۔

یعنی البتہ تحقیق اللہ عزوجل نے تم کو اپنے ان اسماء حسنہ کی تلقین فرمائی ہے کہ جب ان کے واسطے سے کوئی دعا کی جائیگی تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے اور جب ان کے وسیلے سے سوال کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔

نیز صاحب رسالہ قشیریہ فرماتے ہیں کہ میں نے استاد ابو علی سے سُنا وہ فرماتے تھے کہ یعقوب بن لیث کو کوئی بیماری ایسی لاحق ہوئی کہ تمام اطباء اس کے علاج سے عاجز ہو گئے تو لوگوں نے اس سے کہا کہ آپ کی ولایت میں ایک صالح شخص ہیں جن کا نام سہیل بن عبد اللہ ہے اگر وہ آپ کے لئے دعا فرماویں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں گے۔ چنانچہ بادشاہ نے ان کو بلا بھیجا اور درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دعا فرما دیجئے تو حضرت سہیلؒ نے فرمایا کہ تمہارے حق میں میری دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے جبکہ تمہارے قید خانہ میں بہت سے مظلومین موجود ہیں بادشاہ نے اسی وقت جتنے لوگ اس کے قید خانہ میں تھے سب کو رہا کر دیا۔ تب حضرت سہیل نے اس کے لئے ان الفاظ میں دعا فرمائی۔

اللهم کما اریته ذل المعصية فاره عز الطاعة و فرج عنه۔ یعنی یا اللہ جیسا کہ آپ نے اس کو معصیت کی ذلت دکھائی ایسے ہی

طاعت کی عزت دکھا دیجئے اور اس کی تکلیف دور فرما دیجئے۔

پس وہ فوراً اچھا ہو گیا اور حضرت سہیلؒ کی خدمت میں کچھ مال پیش کیا انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار فرمایا تو لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اگر اس کو قبول فرما لیتے اور فقراء کو دیدیتے تو کیا حرج تھا پس انہوں نے صحرا کی کنکریوں کی طرف ایک نظر فرمائی اور وہ اسی وقت جواہر ہو گئیں۔ تو اپنے اصحاب سے فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ایسی دولت عطا فرمائی ہو کیا وہ یعقوب ابن لیث کے مال کا محتاج ہو سکتا ہے؟

اسی طرح حضرت لیث سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ میں نے ابن نافع کو نابینا دیکھا پھر کچھ دنوں کے ان کو دیکھا کہ آنکھ والے ہو گئے میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کی بینائی کس طرح آپ کو واپس ملی تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھ سے کہا گیا کہ یہ دعا پڑھو۔

یا قریب یا مجیب یا سمیع الدعاء یا لطیفا لما یشاء رد علیّ بصری۔ چنانچہ میں نے یہ دعا پڑھی تو اللہ عزوجل نے میری بینائی لوٹا دی۔

سبحان اللہ یہ ہے اجابتِ دعا جو اللہ تعالیٰ اپنے مداوم علی السکینہ بندوں کو مرحمت فرماتے ہیں۔

فرعون کی دعا کا قبول ہونا

اجابت دعا کے سلسلے کے یہ وہ واقعات ہیں جو مؤمنین صالحین سے متعلق تھے اب آپ کے سامنے فرعون کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جسے صاحب روح المعانی نے (ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات) کے تحت لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی ہی عبرت اور نصیحت کا واقعہ ہے۔ وھی ھذا۔

اخرج الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول وابن ابی حاتم عن ابن عباس قال لما اخذ اللہ تعالیٰ آل فرعون بالسنین یبس کل شئ لھم وذھبت مواشیھم حتی یبس نیل مصر، فاجتمعوا الی فرعون وقالوا لہ ان کنت کما تزعم فأتنا فی نیل مصر بماء فقال غدوۃ یصبحکم الماء فلما خرجوا من عندہ

حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آلِ فرعون کو قحط میں مبتلا کیا تو ان کے یہاں کی ہر چیز خشک ہو گئی تمام جانور اور مویشی مر گئے یہاں تک کہ مصر کا مشہور دریا نیل بھی خشک ہو گیا یہ دیکھ کر قوم کے سب لوگ فرعون کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ اگر تو ویسا ہی ہے جیسا کہ تیرا گمان ہے (یعنی معاذ اللہ خدا ہے) تو ہمارے دریائے نیل میں پانی لے آ۔ اس نے کہا اچھی بات ہے کل صبح اس میں

قال ای شئ صنعت
انا لا اقدر علی ذلک
فغداً ایکذبوننی فلما
کان جوف اللیل
قام واغتسل ولبس
مدرعة صوف ثم
خرج حافیا حتی اتی
النیل فقام فی بطنه
فقال اللهم انک لتعلم
انی اعلم انک تقدر
علی ان تملأ نیل مصر
ماء فاملأه ماء فلما
علم الا بخریر الماء یقبل
فخرج واقبل النیل مطرعا
بالماء لما اراد الله تعالی
بهم من الهلکة۔
روح المعانی ص۲۸ پ ۹

پانی آجانے کا جب لوگ اس کے پاس
سے چلے گئے (اور فرعون تنہا ہوا) تو اس
نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں کیا کروں گا۔
میں تو پانی لانے پر قادر نہیں نتیجہ یہی ہوگا
کہ یہ لوگ کل صبح میری تکذیب کریں گے
(اور میں رسوا ہو جاؤں گا) چنانچہ جب
آدھی رات ہوئی تو فرعون اٹھا اور غسل
کیا اور صوف کا جبہ پہنا اور ننگے پاؤں
نیل کے پاس آیا اور دریا کے بیچ میں
کھڑے ہو کر یہ دعا کی کہ اے اللہ تو جانتا
ہے کہ میں تجھ کو اس بات پر قادر سمجھتا
ہوں کہ دریائے نیل کو تو پانی سے بھر
سکتا ہے لہذا تو اسے پانی سے بھر دے
اس کا اتنا کہنا تھا کہ اسے پانی کے آنے کا
شور محسوس ہوا۔ فوراً دریا سے باہر نکل
آیا اور دریائے نیل پانی سے لبریز ہو کر
رواں ہو گیا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں
فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت اسی
نیل میں غرق ہو کر مقدر تھی۔

سبحان اللہ یہ روایت عجیب روایت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ
کافر کی بھی دعا قبول فرمالیتے ہیں۔ دیکھئے فرعون کی دعا کو بھی شرف قبول بخشا۔

حالانکہ وہ خدائی کا مدعی تھا لیکن جب تنہائی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز کا اقرار کیا اور معاملہ کو اسی کے حوالہ کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی شان قدرت دکھلائی کہ دریا کو جاری فرما دیا اور اس کی پرواہ تک نہیں کی کہ یہ کافر ہے میری ہمسری کا دعویدار ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ خدائی ہی اخلاق تھے جو دشمن کے ساتھ بھی ایسا معاملہ روا رکھا گیا دوسرا کوئی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔

یہاں میں اتنی بات اور کہتا ہوں کہ جب کافر کی دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ فرمایا تو اگر اللہ تعالیٰ سے کوئی مومن موحد اور اللہ تعالیٰ کا ماننے والا خلوص کے ساتھ صدق دل سے حالتِ اضطرار میں اپنی کوئی حاجت طلب کریگا تو کیا اللہ تعالیٰ اسے قبول نہ فرمائیں گے ضرور قبول کریں گے ؎

دوستاں را کجا کنی محروم   تو کہ با دشمناں نظر داری

میں اپنے احباب کو وصیت کرتا ہوں کہ اس قصہ کو بار بار پڑھیں اور اسے ذہن میں مستحضر کر لیں اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت پر بھی نظر ہو جائے گی اور انشاء اللہ تعالیٰ معرفت کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہی نصیب ہو جائے گا۔

تاخیر اجابت کا سبب

آخر میں ایک ضروری بات بیان کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مؤمن اخلاص کے ساتھ دعا کرتا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دعا قبول نہیں ہو رہی ہے اس وقت ظاہر ہے کہ انسان اس کی وجہ سے دل شکستہ ہو جاتا ہے پس اس تاخیر کا سبب مولانا رومؒ نے مثنوی میں بہت ہی عمدہ بیان فرمایا ہے۔ ایسا کہ ہر مؤمن کو اس کے سننے کے بعد تو

بالکل تسلی اور اطمینان ہی ہو جاتا ہے ایک مقام پر یہ سُرخی قائم فرمائی ہے
کہ "سبب تاخیر اجابت دعائے مؤمن۔" اور اس کے تحت یہ فرمایا کہ :-

اے بسا مخلص کہ نالد در دعا — دود اخلاصش برآید تا سماء

بسا مخلص ایسے ہیں کہ اپنی دعا میں اس طرح سے نالہ و فریاد کرتے ہیں کہ ان کے
اخلاص کا دھواں آسمان تک پہنچ جاتا ہے۔

تا رود بالائے ایں سقف بریں — بوئے مجمر از انین المذنبیں

یہاں تک کہ گنہگاروں کی فریاد کرنے کی وجہ سے ان کے قلب کی انگیٹھی کی خوشبو
اس آسمان سے اوپر تک جاتی ہے۔

پس ملائک با خدا نالند زار — کائے مجیب ہر دعا و مستجار

یہ دیکھ کر فرشتے اللہ تعالیٰ سے زار زار نالہ کرتے ہیں کہ اے دعاؤں کی اجابت
کرنے والے اور اے وہ ذات جس کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔

بندۂ مومن تضرع می کند — او نمی داند بجز تو مستند

یہ مؤمن بندہ تجھ سے تضرع وزاری کر رہا ہے اور سوا آپ کے کسی اور کو تکیہ گاہ اور اپنا
سہارا نہیں سمجھتا

تو عطا بیگانگاں را می دہی — از تو دارد آرزو ہر مشتہی

آپ تو بیگانوں کو بھی عطا فرماتے ہیں اور آپ سے تو ہر خواہشمند آرزو رکھتا ہے
مؤمن مخلص کی دعا اور ملائکہ کی سفارش نقل کر کے مولانا روم رحمۃ
اللہ علیہ آگے حق تعالیٰ کا جواب نقل فرماتے ہیں اور وہی سبب ہے تاخیر اجابت کا
جو کہ مقصود بیان ہے فرماتے ہیں کہ ؎

حق بفرماید نہ از خواری او ست — عین تاخیر عطا یاری او ست

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہماری یہ تاخیر اجابت کچھ اس کی بے قدری کے سبب سے نہیں

بلکہ وہی تاخیر اس کے حق میں عین کرم ہے اور اس کی اعانت ہے۔

نالۂ مومن ہمی داریم دوست گو تضرع کن کہ این اعزاز اوست

بات یہ ہے کہ مومن کی یہ آہ و فغاں ہم کو پسند ہے اس سے کہو کہ اور گریہ وزاری کرے کیونکہ اس میں اس کا اعزاز ہے

حاجت آورد ش ز غفلت سوئے من آں کشیدش مو کشاں در کوئے من

اس لئے کہ وہ تو غفلت میں پڑا ہوا تھا اس کی حاجت ہی اس کو میری طرف لائی اسی نے اس کی چوٹی پکڑ کر میرے کوچہ میں اسے پہنچایا۔

گر برآرم حاجتش او وا رود ہم درآں بازیچہ مستغرق شود

اگر میں فوراً اس کی حاجت پوری کردوں تو پھر اپنی پرانی حالت پر لوٹ جاویگا اور اسی سابقہ کھیل میں مشغول ہو جاوے گا۔

گرچہ می نالد بجاں یا مستجار دل شکستہ سینہ خستہ سوگوار

خوشش ہمی آید مرا آواز او واں خدایا گفتن و آں راز او

یہ جانتا ہوں کہ جان و دل سے نالہ کررہا ہے اور مجھے پکار رہا ہے دل اس کا شکستہ ہے سینہ خستہ ہے اور خود وہ غمزدہ ہے بایں ذواعی میں جو اس کی دعا قبول نہیں کررہا ہوں تو اس لئے کہ مجھے اس کی آواز ہی بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کا یا خدا یا خدا کہنا اور مجھے ہمراز بنانا پسند آتا ہے۔

زانکہ اندر لابہ و در ماجرا می فریباند بہر نوعے مرا

اور اس کی یہ بات بھی مجھے پسند ہے کہ وہ اپنے عرض مدعا میں طرح طرح سے تملق و چاپلوسی کرکے مجھے پھسلاتا ہے۔

طوطیاں و بلبلاں را از پسند از خوش آوازی قفس در می کشند

دیکھو! بلبل اور طوطی کو جو قفس میں بند کرتے ہیں تو اسی لئے کہ وہ اپنی خوش

آوازی کی وجہ سے لوگوں کو پسند ہوتی ہے۔

زاغ را وجغد را اندر قفص — کے کند این خود نیا مد در قصص

اور اُلّو اور کوّے کے بارے میں کسی داستان میں یا کسی کی زبان سے نہ سنا ہوگا کہ کسی نے انہیں بھی پنجرے میں پالا ہو۔

آگے مولانا روم رحؒ تاخیر اجابت مؤمن بوجہ پسندیدگی کی ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ:۔

پیش شاہد باز چوں آید دو تن — آں یکے کمپیر و دیگر خوش ذقن

دیکھو کسی حسن پسند کے سامنے جب دو شخص آویں ایک تو ان میں بڑھیا ہو اور دوسری قبول صورت ہو۔

ہر دو نان خواہند او زود تر فطیر — آرد و کمپیر را گوید کہ گیر

اور دونوں اس سے روٹی طلب کریں تو وہ جلدی سے روٹی لادے گا اور بڑھیا کو تو دے کر رخصت کر دے گا

واں دگر را کہ خوشستش قد و خد — کے دہد ناں بل بتاخیر افگند

اور اس دوسری کو جس کا قد اور خد خوبصورت ہے اور اس کو پسند ہے اس کو روٹی دینے میں تاخیر کرے گا۔

گویدش بنشیں زمانے بے گزند — کہ بخانہ نان تازہ می پزند

یعنی اس سے کہیگا کہ آرام سے ذرا دیر بیٹھو گھر میں تازی روٹی پک رہی ہے پک جائے تو دوں۔

چوں رسد آں نان گرمش بعد کد — گویدش بنشیں کہ حلوا می رسد

پھر جب بہت دیر کے بعد گرم روٹی لے آوے گا تو اس سے کہیگا کہ اچھا تھوڑی دیر اور بیٹھ حلوا آتا ہے اس کے ساتھ کھانا۔

ہم بدیں فن دار دارشش می کند　　　وز رہِ پنہاں شکارشش می کند

غرض اسی تدبیر سے اس کو ذرا اور ٹھہرو ذرا اور ٹھہرو کہتا رہتا ہے اور مقصد پنہانی اس کو شکار کرنا ہوتا ہے۔

کہ مرا کاریست با تو یک زماں　　　منتظر می باش اے خوب جہاں

آخر میں کہتا ہے کہ مجھ کو تجھ سے ایک کام ہے تھوڑی دیر اور انتظار کر لے حسینِ جہاں۔

تا بدیں حیلت فریباند ورا　　　تا مطیع و رام گرداند ورا

اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بہانہ سے اس کو پھسلاوے تاکہ اس کو اپنا مطیع و مسخر کر لے۔

اس کے بعد مولانائے روم دعائے مؤمن میں بھی حق تعالیٰ کی تاخیر اجابت کا اس مثال کے ساتھ انطباق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

مثل آں کمپیر داں بیگانگاں　　　شاہد خوش روئے مثل مومناں

پس اسی بڑھیا کی طرح بیگانوں کو سمجھو (کہ ان کو فوراً دے کر دفع کر دیا جاتا ہے) اور شاہد خوش رو مثل مومنوں کے ہے (جس کو دینے میں تاخیر کی جاتی ہے اور مقصود اس کے جمال کا دیکھنا ہوتا ہے)

ایں جہاں زندانِ مومن زیں بود　　　کافراں را جنت حالے شود

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یہ دنیا سجن مومن کہلاتی ہے کہ اس کی حاجات کم پوری ہوتی ہیں جس سے وہ تنگ بھی ہوتا ہے اور کافروں کے لئے جنت ہے کہ ان کی اکثر حاجات مرضی کے موافق پوری ہو جاتی ہیں۔

بے مرادی مومناں از نیک و بد　　　تو یقیں میداں کہ بہر ایں بود

حاصل کلام یہ کہ مومن خواہ نیک ہو یا بد وہ جو کبھی اپنی مراد کو نہیں پاتا تو یقین کر لو

کہ اس کی وجہ یہی ہے، یعنی اس کی گفتگو کا پسند ہونا، باقی حق تعالیٰ کی ناراضگی یا بندے کی خواری ہرگز اس کا منشا نہیں ہے۔

سبحان اللہ کیسا تسلّی بخش مضمون ہے اب اس کے دیکھنے کے بعد بجائے اس کے کہ تاخیر اجابت کی وجہ سے طبیعت ملول ہو حق تعالیٰ کے اس کرم اور عنایت پر نظر کر کے اور اس امر کا تصور کر کے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی دعا سننا چاہتے ہیں فدا ہونے کو جی چاہتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان کے ماں باپ سے بھی زیادہ رحیم ہیں۔ قصور ہمارا ہی ہے کہ ہم کو مانگنے کا ڈھنگ نہیں آتا ورنہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے صالحین بندوں کو اس دار دنیا میں بھی بہت کچھ دیا ہے۔

(اللہ تعالیٰ ان صالحین کی برکات ہم سب کو نصیب فرمائے سہ

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ
لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا

اَللّٰهُمَّ اٰتِنِيْ اَفْضَلَ مَا تُؤْتِيْ عِبَادَكَ الصّٰلِحِيْنَ)

از مرتب

ضمیمہ نسبت صوفیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ولایت کا ثبوت تو خود کتاب و سنّت سے ہے قال اللہ تعالیٰ
اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝
وقال اللہ تعالیٰ ۔ وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ۔ لیکن یہ کہ اس کے مصداق
کون لوگ ہیں؟ اور کون سی جماعت اس صفت کے ساتھ متصف ہے
اس کو بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ ولایت تو ایک باطنی چیز ہے
اور جب باطنی چیز ہے تو اس کا مصداق متعین ہونا چاہیئے ورنہ یا تو عام مومنین
کو اس کا مصداق سمجھ لیا جاتے گا یا کوئی مصداق ہی اس کا ذہن میں نہیں ہوگا
اس کے متعلق اس وقت آپ کے سامنے حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ
صاحب پانی پتی رحؒ کے رسالہ ارشاد الطالبین سے ایک مضمون نقل کرتا ہوں
جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مصداق حضرات صوفیہ ہیں (حضرت قاضی
صاحب کی ہستی مشہور و معروف ہے آپ شاہ ولی اللہ قدس سرّہٗ کے تلمیذ رشید
اور حضرت مظہر جانجاناںؒ کے خلیفہ ہیں ۔ محدث، مفسر، متکلم اور صوفی گذرے
ہیں ۔ حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحبؒ آپ کو بیہقی وقت فرمایا کرتے
تھے) آپ فرماتے ہیں کہ :۔

پس معلوم شد کہ سوائے کمالاتِ ظاہری کمال است باطنی کہ آں تفاوتِ درجات بسیار دارد۔ چنانچہ حدیثِ قدسی برآں دلالت می کند کہ حق تعالیٰ می فرماید۔ ہر کہ بمن یک وجب نزدیکی جوید من بوے یک گز نزدیکی جویم وہر کہ بمن یک گز نزدیکی جوید من بوے یک باع کہ سہ ونیم گز باشد نزدیکی جویم۔

معلوم ہوا کہ کمالات ظاہری کے علاوہ ایک کمال باطنی بھی ہوتا ہے اور اس کے درجات مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو بندہ میری جانب ایک ہاتھ قریب ہوتا ہے میں اس کی جانب ایک گز قریب ہوتا ہوں اور جو شخص میری طرف ایک گز قریب ہوتا ہے میں اس کی جانب ایک باع قریب ہوتا ہوں اور ایک باع ساڑھے تین گز کا ہوتا ہے۔

وفرماید کہ بندہ ہمیشہ بمن نزدیکی می جوید بہ عبادتِ نافلہ تا آنکہ من اورا دوست می دارم وچوں اورا دوست میدارم بینائی وشنوائی وقدرتِ او من می شوم

اور فرمایا کہ بندہ ہمیشہ میری جانب عبادات نافلہ کے ذریعہ قرب تلاش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس کو محبوب بنا لیتا ہوں اور جب اس کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کی آنکھ کان اور ہاتھ بن جاتا ہوں کہ میرے ہی ذریعے اس کے سب کام انجام پاتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت قاضی صاحب رح نہایت محکم دلیل اس پر قائم فرماتے ہیں کہ حضرات مشایخ اس کمال باطنی کے حامل ہوتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ :۔

جماعتے بے نہایت کہ اتفاقِ شاں بر کذب عقل محال می داند

بے شمار لوگوں کی ایک جماعت جس کے جھوٹ پر متفق ہونے کو عقل محال سمجھتی ہے بسبب ان کے بے نہایت ہونے کے اور بسبب ان کے تمام اکناف عالم میں منتشر ہونے کے۔ یہ تواتر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تواتر ہے اور بوجہ تواتر کے اس کا علم قطعی۔

و آں جماعتے بقسمے است کہ ہر ہر فردِ شاں بسبب تقویٰ و علم بقسمے است کہ تہمت کذب بر وے روا نباشد

اور وہ جماعت اس قسم کی ہے کہ اس کا ہر ہر فرد بسبب اپنے تقویٰ اور علم کے ایسا درجہ رکھتا ہے کہ اس پر جھوٹ (کذب) کی تہمت لگانا جائز نہیں ہے

(ف) یہ دلیل نقلی ہے کہ شرعاً ایسوں پر اتہام جائز نہیں۔ غرض ان دونوں دلیلوں سے یہ مضمون ہم جس کو بیان کرنا چاہتے ہیں ثابت ہے۔

بزبانِ قلم و قلم زبان خبر می دہند کہ ما را بسبب صحبت مشائخ کہ سلسلۂ صحبت بر سولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرسد در باطن حالتے پیدا آمدہ سوائے عقائد و فقہ کہ قبل از صحبت شاں بداں متحلی بودند و ازیں حالت کہ حاصل شدہ محبت با خدا

ایسی جماعت زبان قلم اور قلم زبان سے یعنی تحریراً و تقریراً خبر دیتی ہے کہ ہم کو مشایخ کی صحبت سے جن کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، عقائد و فقہ کے سوا جن سے وہ ان کی صحبت سے پیشتر بھی بہرہ یاب تھے باطن میں ایک نئی حالت پیدا ہو گئی ہے (جس سے وہ پہلے

ودوستانِ خدا واعمالِ صالحہ
وتوفیقاتِ حسنات ورسوخ
دراعتقادات زائد شدہ۔

آشنا بھی نہ تھے اور جس چیز سے آدمی
آشنا تک نہ ہو تو ہوسکتا ہے کہ اس کا انکار
کردے۔ چنانچہ آجکل بکثرت طریقِ باطن کا
جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں انکار ہو رہا ہے
اور انکار کے بعد اس کے برکات سے کیا حصہ
نصیب ہوسکتا ہے اور اسی حالت کے انکار
سے جو حضرات اس کے حامل ہیں ان کا
بھی انکار ہو رہا ہے) اور اس حاصل شدہ
حالت سے ان کے دل میں خدا اور خدا
کے دوستوں سے محبت اور اعمالِ صالحہ
کا شوق اور نیکیوں کی توفیق اور سچے اعتقادات
اور زیادہ راسخ ہو گئے۔

اس حالت کے یہ ثمرات و برکات ہیں۔ خدا کی محبت، دوستانِ خدا کی
محبت، اعمالِ صالحہ کی محبت اور توفیق اور سابق اعتقادات میں رسوخ، کہ
جس سے شکوک اور وساوسِ واہیہ کا جو درباب اعتقادات آیا کرتے ہیں قلع
قمع ہو جاتا ہے۔

چنانچہ یہ حضرات اکابر ان لوگوں کو جو اس حالت سے متصف نہیں ہیں
خشک کہتے ہیں جیسا کہ کتبِ تصوف سے اس کا پتہ ملتا ہے۔ آگے قاضی
صاحبؒ فرماتے ہیں۔

واین حالت کہ البتہ کمال است
موجب کمال است۔

اور اس میں شک نہیں کہ یہ حالت خود بھی
کمال ہے اور دیگر کمالات کے حصول کا بھی

.... ہم نے ذکر کیا ہے احصول کا ذریعہ بھی ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص اس حالت سے متصف ہو وہ کامل ہے اور اس کا فیض چونکہ دوسروں تک متعدی بھی ہوتا ہے لہٰذا وہ مکمل بھی کہلاتا ہے۔

قاضی صاحبؒ نے اس طرح سے جو اس مضمون کو بیان فرمایا ہے اور اس سے ولایت کا اثبات فرمایا ہے تو یقیناً یہ الہامی مضمون ہے اور بلاشبہ اس سے ولایت کا اثبات ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہم سب کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین۔

جناب قاضی صاحب کا امت پر یہ احسان عظیم ہے کہ اتنی بڑی چیز جو مسلسل چلی آرہی تھی وہ مفقود ہو رہی تھی اور صرف فقہ اور اعتقادات کو لوگ دین سمجھتے تھے جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے آپ نے اس کی جانب امت کو متوجہ فرمایا۔ یہ احیاء اور تجدید ہے قاضی صاحب کو دربار رسالت سے اسی خدمت کی وجہ سے کیا کچھ ملا ہو گا۔ میں حضرات علماء کی توجہ اس طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں اور آج صوفیہ کی اسی نسبتِ سلسلہ کی جانب توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ہم ایک بڑی دولت سے محروم ہیں اور ایک بڑی سنت کے تارک ہو رہے ہیں۔

قاضی صاحبؒ نے اس بیان کے ذریعہ علماء اور صوفیہ کے ایک قدیمی نزاع ہی کو ختم کر دیا ورنہ تو بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے باہم ان دونوں جماعتوں کے مابین ایک خلیج نزاع کی حائل ہو گئی تھی۔ قاضی صاحبؒ نے تواتراً اس کو ثابت فرمایا کہ علماء ربانی نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ مشائخ کی صحبت سے ہم نے اپنے باطن میں ایک نئی کیفیت محسوس کی ہے جس نے ہمارے سابق علوم و اعمال میں ایک روح ڈال دی ورنہ اس سے پہلے ہمارے اعمال حال سے اور ہمارے جملہ مشاغل کیف سے خالی تھے اس سے معلوم ہوا کہ مشائخ کے پاس

کوئی دولت ہے جس سے علماء بھی مستغنی نہیں ہیں اور ہر زمانہ میں اس کے طالب ہوئے ہیں۔

اور اس میں شک نہیں کہ علماء اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم ظاہری کے حامل ہیں تو صوفیائے کرام بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کے وارث ہیں، جیسا کہ یہی قاضی صاحبؒ اپنے ایک دوسرے رسالہ "مالابد منہ" میں فرماتے ہیں کہ:

بداں اسعدک اللہ تعالیٰ ایں ہمہ کہ گفتہ شد صورت ایمان واسلام وشریعت است ومغز وحقیقت اودر خدمت درویشاں باید جست وخیال نہ باید کرد کہ حقیقت خلاف شریعت است کہ ایں سخن جہل وکفر است۔

(مالابد منہ)

جانو! اللہ تعالیٰ تم کو نیکبخت بنائے کہ یہ بیان جو گذرا یہ تو ایمان واسلام اور شریعت کی ظاہری صورت تھی باقی اس کا مغز اور حقیقت درویشوں کی خدمت میں تلاش کرنا چاہئے اور یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ حقیقت شریعت کے خلاف (یعنی مقابل) کوئی چیز ہے کیونکہ ایسی بات زبان سے نکالنا جہالت بلکہ کفر ہے۔

پھر ذرا آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:

نور باطن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را از سینۂ درویشاں باید جست و بداں نور سینۂ خودرا روشن باید کرد تا ہر خیر وشر بفراست صحیحہ دریافت شود۔

(مالابد منہ)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نور باطن کو بزرگوں کے سینہ سے حاصل کرنا چاہئے اور اس نور سے اپنے سینہ کو روشن اور منور کرنا چاہئے تاکہ ہر خیر اور شر فراست صحیحہ کے ذریعہ معلوم ہو سکے۔

....

اس سے معلوم ہوا کہ نورِ باطن (یعنی نسبۃ اور سکینۃ) کے حامل یہی حضرات ہوئے ہیں اور جیسا کہ قاضی صاحبؒ نے فرمایا ہے اس کی وجہ سے ان کے اندر فراست اور بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب سے بہت سی چیزیں جو دوسروں پر مخفی ہوتی ہیں ان حضرات پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔

یہی مطلب ہے اس حدیث شریف کا کہ اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللہِ۔ یعنی مؤمن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے چنانچہ حاشیہ "مالابد منہ" میں حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ کا اس پر ایک واقعہ لکھا ہے کہ:۔

"ایک شخص درویشوں کا سا جبّہ و دستار پہنے ہوئے حضرت کی مجلس میں آکر ایک گوشہ میں بیٹھ گیا جب حضرت خواجہ اپنے پند ونصائح سے فارغ ہوئے تو وہ شخص کھڑا ہو گیا اور کہا کہ حضرت "اتقوا فراسۃ المؤمن" کا کیا مطلب ہے؟ اور اس فراست کا ذرا نمونہ دیکھنا چاہتا ہوں"۔

فرمایا کہ وہ فراست یہی ہے کہ تم اپنی زُنّار توڑ دو۔ یہ سُن کر وُہ چلّایا کہ معاذ اللہ زُنّار سے مجھے کیا سروکار۔ حضرت کا اشارہ پاکر ایک مرید نے بڑھ کر اس کی ربائی گدڑی کو الٹ دیا تو اس کے نیچے سے زُنّار نکلی۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا۔

خواجہ صاحب نے فرمایا کہ یارو! آؤ ہم سب بھی اپنے باطنی زُنّار کو توڑ کر اللہ تعالیٰ سے نیا عہد باندھیں۔ اس پر مجمع سے ایک شور اٹھا اور سب نے تجدید بعیت کی۔ سبحان اللہ!

(حاشیہ مالابد منہ)

دیکھا آپ نے یہ تھا نور جو اللہ تعالیٰ اپنے مقبولین کو عطا فرماتے ہیں بزرگوں نے اس نور اور نسبتہ سے کیا کیا کام لئے ہیں اس سلسلہ کے واقعات سے کتابیں پڑہیں چنانچہ مجھے اس واقعہ پر حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رح کا ایک واقعہ نہیں بھولتا اور اس میں شک نہیں کہ عجیب وغریب واقعہ ہے اسی نور باطن سے متعلق۔ اس واقعہ کے سننے کے بعد حضرت شاہ صاحب سے عقیدت ومحبت بہت زیادہ ہوگئی۔ آپ بھی سنئے اور ایمان تازہ کیجئے۔

(۱) ایک شخص نے کسی آریہ کی کتاب دیکھی جس میں اس نے اسلام پر اعتراضات کئے تھے اس کے قلب میں بھی اس کے اعتراض کرنے سے شبہ پیدا ہوگیا۔ اسلام سے بدعقیدہ ہوگیا۔ رمضان شریف کا زمانہ تھا روزہ رکھے ہوئے تھا مگر خیال کیا کہ جب اسلام ہی ٹھیک نہیں ہے (معاذ اللہ) تو پھر اس کے احکام پر عمل کیسا؟ یہ کہہ کر روزہ توڑ دیا۔ شام کو اپنے ایک دوست کے گھر اس سے ملنے گیا افطار کا وقت قریب تھا وہ افطاری وغیرہ سامنے رکھے ہوئے تیار ہی بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ آؤ بھائی، خوب آئے آؤ آج ہمارے ساتھ افطار کرو۔"

اس نے جواب دیا کہ افطار کیا کریں۔ اگر میرا حال تم کو معلوم ہو جائے تو تم مجھ سے بات کرنا اور مجھ کو پاس بٹھانا تک گوارا نہ کرو۔ وہ شخص سمجھدار تھا سمجھ گیا کہ کسی بدعقیدگی میں مبتلا ہوگیا ہے اس نے کہا کہ بیش از بیش یہی نا کہ تم کافر ہوگئے ہوگے تو بھائی ایمان اور کفر کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، ہماری تمہاری تو دوستی ہے اس لئے آؤ اور ہمارے ساتھ افطار میں شریک ہو جاؤ، اور دوسرا کام یہ کرو کہ صبح ہی حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی خدمت میں گنج مراد آباد آجاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کی

ہدایت کا وقت آگیا تھا بات سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ اگلے روز سویرے ہی گنج مراد آباد روانہ ہوگیا۔ خانقاہ میں پہنچا۔ حضرت کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی بس اپنی جگہ سے کود کر اس کی جانب جھپٹے (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منکشف ہوگیا تھا کہ ایک شخص بگڑ گیا ہے اور آپ کے پاس جارہا ہے اس کو ٹھیک کیجئے) اور اس کے سینہ پر بڑی زور سے ہاتھ مار مار کر فرمانے لگے کہ تبلا تجھ کو اسلام میں کیا شبہ ہے۔ تبلا تجھ کو اسلام میں کیا شبہ ہے یعنی اس کو کچھ کہنے اور سننے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ بلکہ از خود اس سے پوچھنے لگے۔ اب جو وہ اپنے اندر غور کرتا ہے تو شبہ کے ساتھ ساتھ قلب میں اس کا جواب بھی موجود۔

چنانچہ اسلام کی جانب سے سینہ بالکل صاف ہوگیا اور اس کی حقانیت پر شرح صدر ہوگیا۔ پھر حضرت ہی کے ہاتھ پر اس نے توبہ کی اور نہایت پاک صاف سینہ والا ہوگیا اور اس کے بعد سے تا حیات کبھی اس کے دل میں اسلام کے کسی مسئلہ کے متعلق ذرا بھی وسوسہ نہیں پیدا ہوا۔

سبحان اللہ کیسا سینہ تھا اور کیا نور تھا۔ یہ ہے بزرگوں کا فیض اور ان کی تاثیر صحبت جس سے یہ حضرات اللہ تعالیٰ کے تعلق اور ان سے نسبت صحیحہ پیدا کرنے کی بدولت نوازے جاتے ہیں۔

اسی قلبی نور اور فراست پر ایک اور واقعہ سنئے:۔

(۲) ایک بزرگ گذرے ہیں حضرت چاند شاہ صاحب بڑے صاحب کشف اور روشن ضمیر بزرگ ہوئے ہیں ایک شخص ان کی خدمت میں مرید ہونے کے لئے آیا۔ اپنے باغ سے کچھ پکے آم ہدیہ کیلئے ہمراہ لایا راستہ میں ایک درخت کے نیچے ایک بڑا سا آم پڑا تھا اس نے اس کو بھی اٹھا کر جھولے میں ڈال لیا۔ شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچ کر وہ ہدیہ پیش کیا۔ حضرت نے

اسی وقت جھوے کو الٹا اور اس بڑے والے آم کو لے کر اس سے کہا کہ۔ میھیاری ہُوٗ ہم ہی کاٹ کے رہا (یعنی اس قسم کے حرام مال دینے کے لئے ہمارا ہی انتخاب تم نے کیا) یہ کہہ کر اس کے سب آم واپس کر دیئے اور فرمایا جاؤ تمہارا ھدیہ نہ لیں گے۔

(۳) انہیں بزرگ کا ایک اور واقعہ ہے کہ اسی طرح سے ایک شخص مرید ہونے کی نیت سے آیا اور جیسا کہ دیہاتیوں کی عادت ہوتی ہے دوسرے کے کھیت سے گنا توڑ کر چوستا ہوا چلا آیا حضرت کی خدمت میں جب ملاقات کے لئے آیا تو فرمایا کہ بھیّا کیسے آئیو اس نے عرض کیا کہ مرید ہونے کے لئے فرمایا کہ اور راستہ میں اوکھیا کاہے توڑے رہیو۔ یہ کہہ کر فرمایا کہ جاؤ تم کو مرید نہ کریں گے۔

یہ سب واقعات مشائخ کے میں اس پر سُنا رہا ہوں کہ ان حضرات کے خلوص کی برکت سے اللہ تعالیٰ شانہٗ ان کو کوئی دولت بخشتا ہے اور ان کے قلوب میں نور ہوتا ہے اور یہی لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باطنی سلطنت کے وارث ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر زمانہ میں علماء ربانی نے ان کی قدر کی اور جب کسی کو پہچان لیا ہے تو پھر اس کے آگے اپنے کو فناء ہی کر دیا ہے۔

یہ ضرور ہوا کہ طریق کا مشائخ کا لوگوں نے انکار بھی کیا ہے لیکن علماء نے جب کسی مانا ہے تو اس میں شک نہیں کہ پھر ان سے زیادہ بزرگوں کو کسی نے مانا بھی نہیں ہے۔

حضرت سید احمد رفاعی رح بھی اپنے زمانہ میں علماء ظاہر کو جماعت صوفیہ کی جانب نہایت مؤثر عنوان سے متوجہ کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ :-

عزیزمن! ان غریب علماء سے بھی تو حجاب میں پڑے ہوئے ہیں
پوچھو! کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے شہروں میں کوئی ایسا شخص رہے
جو زبردست کرامتوں سے منکروں، گمراہوں (اسلام کے مخالفوں) معاندوں
کو دبا دے اور مغلوب کر دے جن کو دیکھ کر مخالفین اسلام خود ہی بول اٹھیں
کہ واقعی اسلام سچا مذہب ہے، بحث و تکرار کی نوبت ہی نہ آئے۔
کیا تمہارا دل یہ چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی زبان
کا سلسلہ بند ہو جائے تمہارے نفس یہ خواہش کرتے ہیں کہ معجزات نبویہ
کی سلطنت جاتی رہے (اگر تمہاری یہی تمنا ہے تو اپنے ایمان کی خیر مناؤ)
اگر نہیں تو بتلاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی ترجمان کون ہے؟
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا نمونہ کس کے پاس ہے؟ تمہارے
پاس ہے یا صوفیہ کے؟ اگر یہ لوگ نہ رہے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ
وسلم کے روحانی اور باطنی کمالات کا نمونہ دنیا کو کون دکھلائے گا؟

(البنیان المشید ص۱۶۰)

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کا تعلق ایسا نہیں ہے کہ
مومن اس سے صبر کر سکے ؎

الصبر یحمد فی المواطن کلها الا علیک فانه مذموم

اسی لئے اللہ تعالیٰ سے نسبت صحیحہ ہر زمانہ میں ایک جماعت نے پیدا
کی ہے اور بعد والوں کو ترغیب دے گئے ہیں۔ چنانچہ یہ نسبت وہ ہے
جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک سے اب تک چلی آ رہی ہے
انبیاء علیہم السلام سے لے کر اولیاء کرام تک سب اس کے حامل رہے
ہیں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اور نہ لوگ اس سے مستغنی ہو سکتے ہیں

چنانچہ حضرات اہل اللہ نے اس کو سمجھا اور اس کی تحصیل کے لئے کمر باندھ لی اور جان کی بازی لگادی اسی کو کسی اہل دل نے خوب کہا ہے

ہیں بھی اس پر مر مٹا ناصح تو کیا بیجا کیا
اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

اور اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ان کے عشق کو قلب میں پیوست کرنے والا یہ مضمون ہے۔